پاکستانی ادب کے معمار

سلطان سکون: شخصیت اور فن

قمر زمان

اکادمی ادبیات پاکستان

پاکستانی ادب کے معمار

(سلسلہ ۱۳۵)

سلطان سکون: شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

سلطان سکون: شخصیت اور فن

قمر زمان

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

نگرانِ اعلیٰ	ڈاکٹر یوسف خشک
نگرانِ منصوبہ طباعت :	اختر رضا سلیمی
مصنف	قمر زمان
تدوین	محمد ثقلین ضیغم
اشاعت	2020
تعداد	500
ناشر	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	نسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	مجلد: -/240 روپے
	غیر مجلد: -/200 روپے

ISBN: 978-969-472-463-8

Pakistani Adab Kay Maimar

Sultan Sakoon : Shakhsiyat-aur-Fun

Written By

Qamar Zaman

Publisher

Pakistan Academy of Letters

Islamabad, Pakistan

فہرست

پیش نامہ

پاکستانی ادب کے معمار سیریز کی 145 ویں کتاب، سلطان سکون: شخصیت اور فن پیش خدمت ہے۔

پاکستانی ادب کے قارئین بخوبی جانتے ہیں کہ اکادمی ادبیات پاکستان کے اس اشاعتی سلسلے کا بنیادی مقصد پاکستانی زبانوں کے اہم لکھنے والوں کی خدمات اکا اعتراف کرنا اور انھیں عام قارئین تک پہنچانے کے ساتھ ہے، وہیں ادب کے محققین، ناقدین اور طالب علموں کو ان کے متعلق بنیادی تحقیقی وتنقیدی مواد فراہم کرنا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سلسلے کی تمام کتابوں کی نوعیت تعارفی ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی وتنقیدی بھی ہے۔

سلطان سکون کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں جتنا کام انھوں نے ہندکو ادب کے حوالے سے کیا وہ انھیں سب سے منفرد کرتا ہے۔ ہندکو اُردو لغت سے لے کر ہندکو پہیلیوں، ضرب الامثال، کہاوتوں، محاوروں اور لوک کہانیوں کی تدوین تک انھوں نے بنیادی نوعیت کی خدمات سرانجام دی ہیں۔ بطور شاعر نصف درجن سے زائد شعری مجموعے اس کے علاوہ ہیں۔

ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں کئی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے، جن میں حکومت پاکستان کی طرف سے صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی اور اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے سائیں احمد علی ایوارڈ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس کتاب کے مصنف قمر زمان کا نام اگرچہ علمی وادبی حلقوں میں زیادہ معروف نہیں۔ تاہم اس کتاب کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں، جو ایک اچھا محقق ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب جس محبت، محنت اور لگن سے لکھی، اس کے

لیے ہم اُن کے شکر گزار ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اس کتاب کے ذریعے ہماری ادبی تاریخ کی ایک اہم شخصیت کے بہت سے ایسے گوشے نمایاں ہو کر سامنے آئیں گے، جو اس سے قبل ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔

اس کتاب کی تزئین و آرائش اور طباعت کے لیے میں اپنے رفیق کار اور اکادمی ادبیات پاکستان کے سہ ماہی جریدوں "ادبیات" اور "ادبیات اطفال" کے مدیر اختر رضا سلیمی کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کی اضافی ذمے داری بھی احسن طریقے سے نبھائی۔

ہمیں قارئین کی تجاویز و آرا کا انتظار رہے گا۔

(ڈاکٹر یوسف خشک)

چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان

پیش لفظ

ہزارہ کے ادبی منظر نامے پر اُبھرنے والے جن اہلِ قلم نے شہرت و ناموری حاصل کی اور بڑے ادبی مراکز سے دور رہ کر نام کمایا ان میں سلطان سکون منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے دیگر معاصرین میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو کسی نہ کسی طرح درس و تدریس یا دیگر علمی شعبہ جات سے وابستہ رہے۔ لیکن سلطان سکون کا شعبۂ ملازمت حسابات یعنی اکاؤنٹس کا تھا۔ لہٰذا انھوں نے محض اپنے ذوق وشوق اور محنت و ریاضت سے اُردو اور ہندکو کے نمائندہ ادیب کی حیثیت سے ملک گیر شہرت حاصل کی اور ثقہ اہلِ علم سے داد و تحسین سمیٹتے رہے۔ انھوں نے کئی سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات اپنے نام کروائے جن میں ملک کا اعلیٰ ترین سول اعزاز ''تمغۂ حسنِ کارکردگی'' بھی شامل ہے۔ یہ تمام اعزازات ان کی مسلسل محنت و ریاضت کا ثمر ہیں۔

میرے لیے یہ بات کسی اعزاز سے کم نہیں کہ مجھے اکادمی ادبیات کی طرف سے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے سلسلے میں سلطان سکون کی شخصیت اور فن پر کام تفویض کیا گیا۔ میں خدائے بزرگ و برتر کے حضور سر بسجود ہوں کہ جس نے مجھے یہ کام مکمل کرنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائی۔

یہ کام میرے لیے انتہائی مشکل ہوتا اگر اس دوران مجھے میرے احباب کی مدد اور حوصلہ افزائی میسر نہ آتی۔ لہٰذا میں ان احباب کا سپاس گزار ہوں۔ سب سے پہلے سلطان سکون صاحب کا شکریہ کہ ان سے جب بھی ملاقات کا وقت مانگا انھوں نے بڑی فراخ دلی سے خوش آمدید کہا اور اس ضمن میں ہر حوالے سے مکمل تعاون کیا۔

اور تہذیب خان کا شکریہ کہ میرے لکھے ہوئے لفظوں کو کمپیوٹر کے پردوں پر منتقل کیا حالاں کہ وہ اس دوران اپنے ایم فل کے تحقیقی کام میں مصروف تھے۔ محمد ثقلین ضیغم اور حسنین ساحر؛ دونوں بھائیوں کا شکریہ کہ انھوں نے نہ صرف میری ہر مرحلے پر حوصلہ افزائی کی بلکہ قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ ان کے ساتھ ساتھ قائم علی (صوابی) اور ملک شفیق (تلہ گنگ بھی ہر لحہ میری ہمت بڑھاتے رہے۔ آسیہ پروین نے بھی اس کام کی تکمیل کے لیے مجھ پر دبا ڈالے رکھا۔ ان کا بھی انتہائی شکریہ۔

عاصم شہزاد ہر محفل میں مجھ سے اس کام کی تکمیل کا تقاضا کرتے رہے۔ وہ بھی شکریہ کے مستحق ہیں۔ جناب احمد حسین مجاہد اور ہارون الرشید نے سلطان سکون کے حوالے سے اپنے مضامین بھیجے جب کہ سہ ماہی ''شعر و سخن'' کے مدیر معروف شاعر و ادیب جان عالم نے شعر و سخن کا ''گوشۂ سلطان سکون'' مہیا کیا۔ ان کا بھی شکریہ مجھ پر واجب ہے۔

سلطان سکون کے دیرینہ احباب میں سے جناب شاہ نواز سواتی کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا اس لیے ضروری ہے کہ انھوں نے نہ صرف ملاقات کا وقت دیا اور سلطان سکون کے حوالے سے اپنی یادوں سے بہت ساری قیمتی معلومات دیں، بلکہ ان کے دورۂ ماریشس کے حوالے سے بھی بڑی اہم معلومات کا تبادلہ کیا۔

سب سے زیادہ شکریہ کے مستحق اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین جناب ڈاکٹر یوسف خشک ہیں جن کی خصوصی توجہ کی وجہ سے یہ کتاب آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

آخر میں اپنے اہلِ خانہ کا شکریہ بھی مجھ پر لازم ہے کہ جنھوں نے اس کام کے دوران سازگار ماحول مہیا کیا۔ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے میں نے اپنی دیگر مصروفیات کو بالائے طاق رکھا۔ اس کے باوجود اس کام میں اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو اس کے لیے میری کم مائیگی ہی جواز ہے۔

قمر زمان

باب: اوّل

سلطان سکون کا زندگی نامہ

خاندانی پس منظر:

اٹھارویں صدی کے اختتام اور انیسویں صدی کے آغاز میں کشمیر میں ڈوگرہ راج تھا۔ سکھوں نے طاقت کے ذریعے عوام کو محکوم بنا رکھا تھا اور ان پر طرح طرح کے مظالم روا رکھے جاتے تھے۔ غریب کسانوں پر بھاری لگان بھی ظلم کی ایک صورت تھی جس نے کسانوں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ جتنے بھی لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے ان سے بے دریغ لگان وصول کیا جاتا تھا اور عدم ادائیگی کی صورت میں انھیں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔

اس صورت حال نے لوگوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا اور لوگ وہاں سے نقل مکانی پر مجبور ہو گئے تھے۔ جس کو جب موقع ملتا وہ کسی دور دراز پر امن علاقے کی طرف ہجرت کر جاتا۔ ان ہی ہجرت کرنے والوں میں ایک نیاز علی خان اعوان بھی تھے جو وہاں کھیتی باڑی کے ذریعے گزر بسر کرتے تھے لیکن روز بروز کے بڑھتے لگان سے تنگ آکر انھوں نے مظفر آباد سے جہاں ان کی اپنی زمینیں تھیں ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا اور ہزارہ کے صدر مقام ایبٹ آباد کی جانب ہجرت کی۔ ایبٹ آباد سے سترہ کلومیٹر شمال مغرب میں کوٹھیالہ کے ایک گاؤں ''عیدگاہ'' کو اپنا مسکن بنایا۔ جہاں کچھ زمیں خرید کر اس پر کاشت کاری شروع کی اور از سر نو زندگی بسر کرنے لگے۔ یہ ایک پسماندہ لیکن پر امن علاقہ تھا لہٰذا انھوں نے اس کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔ سلطان سکون کی غیر مطبوعہ سوانح عمری کے مطابق:

> ''نیاز علی خان کے چار بیٹے تھے اور ایک بیٹی، سب سے بڑے بیٹے حیدر زمان اس کے بعد بالترتیب مظفر خان، خواص خان پھر بیٹی زلیخا جان اور سب سے چھوٹے بیٹے عبدالرحمان۔

نیاز علی خان نے اپنی حیثیت کے مطابق اپنے بچوں کی عمدہ پرورش کی اور اپنی

زندگی میں سب کی شادیاں کر دیں اور سب اپنے گھروں کے ہو گئے۔ حیدر زمان اور خواص خان کی شادیاں اوگرہ گاؤں (مانسہرہ) کے ایک ہی خاندان کی دو سگی بہنوں سے ہوئیں۔ شادی کے کچھ عرصے بعد یہ دونوں بھائی گاؤں سے اپنے حصے کی زمین فروخت کر کے اپنے سسرال کے علاقے اوگرہ منتقل ہو گئے اور وہیں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئے۔ تاہم مظفر خان اور عبدالرحمن نے والدین کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا اور آخر تک والدین کی خدمت کرتے رہے۔

مظفر خان کی شادی ٹھنڈا امیر اسلبیڈ کے ایک شخص گوہر علی کی صاحبزادی کرم جان سے ہوئی اور ان کے ہاں چار بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کی پیدائش ہوئی تاہم ان کے زیادہ تر بچے چھوٹی عمر میں ہی انتقال کر گئے۔ بیٹوں میں صرف سلطان محمد جبکہ بیٹیوں میں مقبول جان اور فضیلت جان زندہ رہے باقی سب کے سب بچپن میں ہی فوت ہو گئے۔(۱)

پیدائش اور ابتدائی حالاتِ زندگی:

سلطان محمد نے ادب کی دنیا میں سلطان سکون کے نام سے شہرت پائی جس کے لیے انھوں نے ایک طویل سفر طے کیا۔ مسلسل جدوجہد کی، زمانے کے گرم سرد جھیلے جس کی ایک الگ داستان ہے۔ اپنی پیدائش اور حالاتِ زندگی کے حوالے سے سلطان سکون نے بتایا کہ:

"میری تاریخِ پیدائش ۲۳ رنومبر ۱۹۳۲ء بروز بدھ اور جائے پیدائش مقام "عید گاہ" کوٹھیالہ ہے یہ تاریخ مصدقہ ہے کیوں کہ یہ میرے والد صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور جس کاپی پر درج ہے وہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔"(۲)

سلطان سکون کا بچپن "عید گاہ" کے قدرتی ماحول میں گزرا جہاں امن و سکون تھا، محبت تھی۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر خلوص سے رہتے تھے۔ جہاں اقدار کی پاسداری تھی۔ تنگدستی کے باوجود لوگ مطمئن زندگی گزارتے تھے۔ قدرت کی فیاضیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا زمانہ تھا۔ جب ہر طرف غربت کا راج تھا۔ سادگی کا زمانہ تھا تعلیم کا حصول ہر ایک کے لیے ممکن نہ تھا خاص خاص لوگ ہی پڑھے لکھے تھے۔ سلطان سکون نے پرائمری تعلیم اپنے گاؤں سے ملحقہ

"پھگلہ" سے حاصل کی۔ جہاں اس وقت صرف پرائمری سکول تھا جو اب کوٹھیالہبائی سکول ہے۔ پرائمری سکول میں جو دو استاد تھے ان میں ایک ماسٹر پائندہ خان اور دوسرے شیر بائی کے کوئی سید تھے۔ ابتدائی تعلیم کے دوران سلطان سکون بیمار بھی ہوئے اور ان کا ایک تعلیمی سال ضائع بھی ہوا۔ تاہم "پھگلہ" سے چار جماعتیں پاس کرنے کے بعد آگے پاس شہر جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کیوں کہ گاؤں کی سطح پر اس سے آگے تعلیم کی کوئی سہولت میسر نہ تھی لہٰذا انھوں نے ایبٹ آباد شہر کا رخ کیا جہاں انھوں نے اسلامیہ ہائی سکول (جو بعد میں نمبر ۲ گورنمنٹ ہائی سکول ہوا اب سینٹینیل ماڈل سکول ہے) میں داخلہ لیا لیکن وہاں ان کا کوئی جاننے والا نہ تھا اس لیے شہر میں رہائش کا مسئلہ درپیش تھا کیوں کہ نہ تو سلطان سکون ہاسٹل کے اخراجات برداشت کر سکتے تھے اور نہ ہی ہوٹل کے، تاہم اس کا یوں حل نکلا کہ بقول سلطان سکون:

"ہمارے گاؤں سے کچھ عرصہ ہی ہوا تھا کہ ایک دھوبی جس کا نام "کالا" تھا ملک پورہ منتقل ہوا تھا۔ میرے والد کی اس سے جان پہچان تھی لہٰذا میرے والد نے اس سے بات کی اور اس نے مجھے اپنے گھر رکھ لیا یوں شہر میں میری تعلیم کا آغاز ہوا لیکن میں اس کے پاس چند ماہ ہی رہا اور اس کے بعد اپنی تائی کے ایک رشتہ دار کے گھر بانڈہ پھگواڑیاں چلا گیا۔ وہاں میں نے تقریباً تین سال گزارے اس دوران میرے اخراجات میرے والد برداشت کرتے رہے جو فوج میں تھے۔ تین سال بانڈہ پھگواڑیاں میں گزارنے کے بعد میں اپنے سکول کے ایک استاد عبدالقیوم قریشی کے گھر منتقل ہو گیا جو کریم پورہ میں اپنے بہنوئی کے ساتھ رہتے تھے۔"(۳)

عبدالقیوم قریشی کے گھر بھی سلطان سکون گھریلو ماحول میں رہے لیکن ان کے استاد چوں کہ مجرد تھے اس لیے استاد کے زیادہ تر کام کاج انھیں کرنے پڑتے تھے اور سکول سے واپسی پر زیادہ وقت انھی کاموں میں گزر جاتا اور پڑھائی کے لیے وقت بالکل نہیں ملتا تھا۔ ایسی ہی صورت حال میں انھوں نے پہلی بار میٹرک کا امتحان دیا جس میں وہ فیل ہو گئے اور اپنے میٹرک پاس کرنے کی روداد وہ کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"۱۹۵۱ء میں میٹرک کا امتحان دیا مگر انگریزی کے مضمون میں فیل ہو گیا۔ اس کے بعد دوبارہ امتحان دیا تو اس دفعہ ریاضی کے مضمون میں فیل ہو گیا۔ تیسری دفعہ پرائیویٹ امیدوار کے طور پر امتحان میں بیٹھا اور یوں ۱۹۵۳ء میں پرائیویٹ امیدوار کے طور پر میٹرک پاس کیا۔"(۴)

سلطان سکون جب میٹرک میں تھے تو اس وقت ان کے والد فوج کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر آ گئے اور محکمہ خوراک کے دفتر میں ملازمت اختیار کر لی۔ ان کی رہائش دفتر سے ملحقہ ایک کمرے میں تھی۔ انھوں نے سلطان سکون کو بھی اپنے ساتھ رکھ لیا اور یوں دونوں باپ بیٹا اکٹھے رہنے لگے۔ پڑھائی کا سلسلہ میٹرک سے آگے نہ چل سکا اور یہ بھی اس دور میں غنیمت تھا کیوں کہ جب سلطان سکون نے میٹرک پاس کیا تو پورے علاقے میں کوئی بھی میٹرک پاس نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان سکون کو اپنے اہلِ خاندان، والدین اور دادا بھی بہت پیار کرتے تھے۔ بلکہ وہ اپنے دادا کے لاڈلے تھے اور دادا بھی ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ سلطان سکون کے والد فوج میں ملازم تھے اور بہت سارے علاقوں میں رہے۔ زیادہ تر وزیرستان کے علاقہ میں رہے جب وہ فوج میں بھرتی ہوئے تو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ کیوں کہ وہ ایک دن بھی سکول نہیں گئے تھے تاہم فوج میں رہ کر انھوں نے پڑھنا لکھنا شروع کیا اور پھر اس حد تک دسترس حاصل کی کہ لوگ ان سے خط لکھواتے اور پڑھواتے تھے۔ ان کے پڑھنے کا بھی ایک دلچسپ پس منظر تھا۔ اس حوالے سے سلطان سکون نے بتایا ہے کہ

> "میرے والد صاحب فوج میں گئے تو وہ ان پڑھ تھے۔ اس زمانے میں خط ہی رابطے کا ذریعہ تھے۔ میرے والد صاحب اپنے ایک جاننے والے سے خط لکھوایا کرتے تھے اور وہی انھیں پڑھ کر بھی سنایا کرتا تھا۔ ایک دن نہ جانے کیا وجہ ہوئی کہ اس نے تھوڑا بیزاری کا اظہار کیا کہ تمھارے روز ہی خط آتے ہیں اس بات سے والد صاحب کو غیرت آئی اور انھوں نے پڑھنے لکھنے کا تہیہ کر لیا اور قاعدہ لے کر خود پڑھنا شروع کر دیا۔ یوں انھوں نے رفتہ رفتہ پڑھنا اور پھر لکھنا سیکھ لیا اور نہ صرف اردو بلکہ فارسی اور بعد ازاں انگریزی میں بھی دسترس حاصل کر لی اور پھر گاؤں کے لوگ ان ہی سے خط لکھواتے تھے کیوں کہ ان کا خط بہت اچھا تھا۔" (۵)

سلطان سکون کے والد کو گاؤں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور لوگ ان کی قدر کرتے تھے انھوں نے سرکاری ملازمت کی اور ایمانداری سے اپنی زندگی گزاری۔ لوگوں سے اچھے تعلقات رکھے۔ سلطان سکون کی والدہ بھی نہایت سادہ اور گھریلو خاتون تھیں۔ وہ نماز روزہ کی پابند تھیں۔ انھوں نے اپنے بچوں کی پرورش نہایت خوش اسلوبی سے کی ورنہ ایک ان پڑھ سادہ سی دیہاتی عورت کے لیے شوہر کی عدم موجودگی میں اتنے بچوں کی پرورش کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن انھوں نے یہ فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے

سر انجام دیا اور اپنے بچوں کو ہمیشہ نیکی اور ایمانداری کا درس دیا۔ انھیں سچائی کی تعلیم دی تا کہ وہ معاشرے میں اپنے والدین کے لیے نیک نامی کا باعث بنیں۔

سلطان سکون آج بھی اپنے والدین کو یاد کر کے رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ وہ ان لوگوں کو خوش قسمت ترین خیال کرتے ہیں جن کے والدین یا ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے۔ ان کے نزدیک والدین ہی دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہیں اور ان کی زندگی میں ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کر کے جنت کمانی چاہیے۔

ملازمت اور عملی زندگی:

سلطان سکون نے جب میٹرک کا امتحان پاس کیا تو اس وقت ریاست امب در بند میں بندوبست اراضی کا کام جاری تھا۔ لہٰذا ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ پٹواری بنیں لیکن سلطان سکون کو پٹواریوں سے سخت نفرت تھی کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ حرام کھاتے ہیں اور ایک کی زمین دوسرے کے نام کر دیتے ہیں یوں یہ غریب اور بے بس لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اس لیے انھوں نے پٹواری بننے سے انکار کر دیا تاہم والد کے اصرار پر پٹواری کی تربیت بھی حاصل کر لی اور امتحان بھی پاس کر لیا لیکن پٹواری نہ بنے لہٰذا ان کا بطور سٹور کیپر محکمہ سول سپلائی میں کام ہو گیا جس کی تفصیل کچھ یوں بیان کرتے ہیں کہ

> ''جب والد صاحب کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ میں نے پٹواری نہیں بننا تو انھوں نے اپنے محکمے کے افسر (ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر) عبدالودود خان سے کہہ کر مجھے محکمہ خوراک میں سٹور کیپر رکھوا دیا جہاں میں نے ۱۰ جولائی ۱۹۵۳ء کو چارج سنبھالا اور پہلی تعیناتی عطر شیشہ (مانسہرہ) میں ہوئی۔''(۶)

اس وقت راشن ڈپو کا سرکاری نظام رائج تھا اور یہ ڈپو مختلف جگہوں پر قائم تھے لہٰذا سلطان سکون کو کئی جگہ یہ ذمے داریاں نبھانی پڑیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سلطان سکون اپنا کام نہایت ایمانداری سے کرتے تھے اور ان کے آفیسر عبدالودود خان جو خود بھی نیک نام آدمی تھے ان پر بڑا بھروسہ کرتے تھے اور جہاں کہیں کوئی بندہ خورد برد کرتا تو اس کی جگہ سلطان سکون کو بھیج دیا جاتا۔ حالانکہ اس دور میں لوگوں نے اس محکمہ میں رہ کر بڑا مال بنایا اور خوب لوٹ مار کی۔ تاہم سلطان سکون کی بھی کہیں سے شکایت موصول نہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ڈاڈر، خاکی، مانسہرہ اور بالاکوٹ میں تعینات کیا گیا اور جب گڑھی حبیب اللہ

کے سٹور کیپر یوسف خان نے حساب میں گڑبڑ کی تو سلطان سکون کو وہاں بھیج دیا گیا حالانکہ بالاکوٹ سے ایک وفد نے خصوصی طور پر انکے آفیسر سے ملاقات کی کہ سلطان سکون کو یہاں سے تبدیل نہ کیا جائے لیکن آفیسر نے کہا کہ یہ سرکاری کام ہیں اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ ان کی ایمانداری کے حوالے سے ان کے آفیسر نے سلطان سکون کے والد سے کہا تھا کہ

"آپ کا بیٹا بہت ایماندار ہے اور جہاں بھی کوئی گڑبڑ کرتا ہے ہم اس کو وہاں بھیج دیتے ہیں اور یہ ایمانداری سے وہاں نظم و نسق چلاتا ہے۔" (۷)

سلطان سکون نے ایک سال گڑھی حبیب اللہ میں گزارا اور پھر راشن ڈپو کا نظام ختم ہو گیا لیکن اس کے باوجود حویلیاں کے ریلوے گودام پر ایک ماہ تک کام کرنا پڑا کہ نظام درست کر لیں۔ اس دوران انھوں نے محکمہ تعلیم میں بھی درخواست دے رکھی تھی اور جب یہ راشن ڈپو والا نظام ختم ہو رہا تھا تو ان کی محکمہ تعلیم میں نوکری ہو گئی جس کی تفصیل بقول سلطان سکون کچھ یوں ہے:

"میں نے اپنے ایک عزیز محمد شفیع کے ذریعے محکمہ تعلیم میں درخواست دائر کر رکھی تھی اور جب وہاں میری نوکری ہو گئی تو یحییٰ شاہ ڈائریکٹر تعلیمات تھے انھوں نے میری تعیناتی کے احکامات جاری کیے میری تعیناتی بطور کلرک اسسٹنٹ انسپکٹر آف زنانہ مدارس ہزارہ کے دفتر میں ہوئی یہاں سے کچھ عرصہ بعد بطور سینیئر کلرک مانسہرہ بھیج دیا گیا وہاں سے پشاور رجسٹرار آفس، پھر واپس گورنمنٹ ہائی سکول ہل بہل کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول نواں شہر میں رہا اور اس کے بعد گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد، پھر کیپر ہیڈ ہائی سکول، اس کے بعد فاٹا اور پشاور میں تعینات رہا، ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز پشاور کے دفتر میں، پھر اکاؤنٹس کلرک ایبٹ آباد بیورو میں رہا۔ اس کے بعد ڈویژنل ڈائریکٹوریٹ میں سپرنٹنڈنٹ کی پوسٹ پر چلا گیا، پھر بطور اکاؤنٹس آفیسر مانسہرہ ڈسٹرکٹ انسپکٹر کے دفتر میں پھر وہاں سے SDEO کے دفتر میں اور آخر میں ایبٹ آباد SDEO کے دفتر میں جہاں سے ۲۵ اپریل ۱۹۹۳ء کو ۶۰ برس کی عمر میں باعزت طور پر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گیا۔" (۸)

سلطان سکون نے اپنی پوری سروس نہایت ایمانداری سے کی اور ہمیشہ نیک نام رہے۔ اکاؤنٹس

جیسے شعبے سے با عزت طور پر سبکدوش ہونا ان کی شرافت اور ایمانداری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ انھوں نے ہمیشہ رزق حلال کو ترجیح دی اور اپنی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کیا اور اس بات کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ آج بھی کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کئی ساتھیوں نے اچھے شہروں میں بڑے بڑے مکانات بنائے۔ لیکن سلطان سکون اپنی زندگی سے مطمئن ہیں کہ انھوں نے مال و دولت تو نہیں بنایا لیکن دلی سکون حاصل ہے۔ ایک ملاقات میں سلطان سکون نے اپنے دل کا حال بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

> ''کلرک تو ہزاروں ہوئے ہوں گے اور اکاؤنٹس کلرک بھی بہت سے گزرے ہوں گے انھوں نے خوب مال بھی بنایا ہوگا لیکن مجھے اللہ پاک نے بے پناہ عزت سے نوازا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں محض کلرک نہیں رہا اور صرف کلرک ہوتا تو گمنامی میں کہیں ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوتا اور بس'' (۹)

اور اپنی زندگی سے مطمئن ہونا بھی اللہ پاک کی نعمتوں میں سے ایک ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ سلطان سکون کو اللہ پاک نے بڑی عزت سے نوازا اور اس کے لیے انھوں نے بڑی محنت کی اور خلوص کے ساتھ اپنے کام میں مگن رہے ہیں۔ انھوں نے ہر صورت میں رزق حلال کو ترجیح دی ورنہ وہ چاہتے تو بڑی آسانی سے عیش کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔

ازدواجی زندگی/اولاد:

سلطان سکون نے دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی شادی والدین کی مرضی سے اپنے چچا خواص خان کی بیٹی زریبہ خاتون سے ہوئی لیکن یہ شادی بدقسمتی سے زیادہ دیر نہ چل سکی اپنی شادی کے حوالے سے سلطان سکون لکھتے ہیں:

> ''زریبہ خاتون سے میری شادی جولائی ۱۹۵۷ء میں ہوئی ۱۹۵۸ء میں میرا ایک بیٹا پیدا ہوا اور ہونے کے بعد فوت ہو گیا۔ ۱۹۵۹ء میں میری ایک بیٹی پیدا ہوئی نجمہ سلطان۔'' (۱۰)

ان کی بیٹی حیات ہے اور اپنی خوش خرم زندگی بسر کر رہی ہے۔ سلطان سکون کی دوسری شادی ۱۹۶۲ء میں ہوئی یہ شادی خدیجہ بی بی سے ہوئی جو محکمہ تعلیم میں ملازم تھیں۔ اس دوران زریبہ خاتون سے

سلطان سکون کی علیحدگی ہوگئی۔

خدیجہ بی بی سے سلطان سکون کی پسند کی شادی ہوئی اور دونوں نے ایک دوسرے سے خوب نبھائی دونوں اپنی شادی اور زندگی سے مطمئن ہیں۔ دوسری شادی سے سلطان سکون کے ہاں چھے بچوں کی پیدائش ہوئی چار بیٹیاں اور دو بیٹے۔ بیٹیوں میں نیلم سلطان، عالیہ سلطان، طیبہ سلطان اور سعدیہ سلطان جبکہ بیٹوں کے نام خورشید محمد اور نوید سلطان ہیں۔

ایک بیٹی نیلم سلطان سکول میں استانی ہیں انھیں شاعری کا بھی شوق ہے اور اپنا یہ شوق بھی پورا کرتی ہیں ان کی ایک بیٹی اور پھر نواسی کو مصوری کا شوق ہے سلطان سکون کے کمرے میں لگی ہوئی تصویر ان کی نواسی مہوش کے موئے قلم کا شہکار ہے۔ اس تصویر پر سلطان سکون نے اپنی نواسی کو ایک ہزار روپے انعام بھی دیا ان کی باقی بیٹیاں اور بیٹے بھی شادی شدہ ہیں اور اپنی اپنی دنیا میں مگن زندگی بسر کر رہے ہیں۔

سلطان سکون کے بیٹے نوید سلطان بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن ایبٹ آباد میں ملازم ہیں۔ جبکہ دوسرے بیٹے خورشید محمد بھی شعبہ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ سب بچے اپنے گھروں میں خوش وخرم ہیں۔

سلطان سکون گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہیں تاہم ان کے بچے ان کا ہر طرح کا خیال رکھتے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح مطمئن ہیں کہ بچوں کی تربیت میں انھوں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی انھیں تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھی تربیت بھی دی تاکہ وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنی زندگی گزار سکیں۔

ادبی سفر کا آغاز:

قدیم زمانے سے دیہاتوں میں یہ رواج رہا ہے کہ لوگ سر شام اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر چوپالوں، حجروں، بیٹھکوں یا گاؤں کے کسی نہ کسی مقام پر اکٹھے ہو جاتے ایک دوسرے کے حال احوال سنتے دکھ درد بانٹتے اور پھر تفریح کے لیے قصے کہانیاں سناتے۔ مقامی زبان میں علاقائی گیت نغمے ، ماہیے، ٹپے یا کلاسیکی ادب کے فن پارے ترنم سے سنتے سناتے۔ اس سے ایک طرف ان کو تفریح مہیا ہو جاتی اور دوسری طرف سننے والوں کے تخلیقی و ادبی ذوق کی آبیاری ہوتی جن کی طبع موزوں ہوتی ان کی روانی کے لیے یہ محفلیں مہمیز کا کام کرتیں۔ گویا یہ نئی نسل کی اخلاقی، تعلیمی، علمی و ادبی تربیت گاہ بھی تھی کئی لکھنے والوں نے اپنی زندگی میں ان محفلوں کو اپنی ابتدائی تخلیقی زندگی کی پہلی سیڑھی قرار دیا۔ سلطان سکون

کا بچپن بھی دیہات کے ایسے ماحول میں گزرا ہے اوران کے اندر بھی شعروادب کی پہلی کرن بچپن سے پھوٹی اس حوالے سے اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ:

''دراصل میرا ابتدائی ماحول گاؤں کا تھا اور بڑے اچھے انداز میں گزرا سر شام لوگ بیٹھتے اور منظوم قصے کہانیاں اور گیت سناتے میرے والد مرحوم بھی بڑے خوش الحانی سے قصہ یوسف وزلیخا سنایا کرتے تھے اس ماحول کی وجہ سے مجھ میں بھی تحریک پیدا ہوئی اور اس طرح بات شاعری تک جا پہنچی۔''(۱۱)

سلطان سکون بھی بچپن میں خوش الحان تھے۔ ماہیہ وغیرہ گاتے تھے، عزیز واقارب کے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر ان سے ماہیے سننے کی فرمائش کی جاتی اور اس حوالے سے وہ اپنے رشتہ داروں میں مشہور بھی ہو گئے تھے۔ اس سے ان کے اندر شاعری کا کچھ ذوق پیدا ہوا جب گاؤں سے شہر آئے اور اسلامیہ ہائی سکول میں داخل ہوئے تو یہ ایک نئی فضا تھی یہاں بھی ان کے اندر شاعری کا ذوق پیدا ہوا۔ تب تک انھیں شعر، نظم، غزل کے بارے میں زیادہ پتہ نہ تھا لیکن جب انھوں نے کورس کی کتاب سرمایہ اردو میں شامل غزلیں اور نظمیں پڑھیں تو انھیں بہت پسند آئیں لہٰذا انھوں نے اپنے دوست غلام سرور مرحوم کے ساتھ مل کر ترنم میں پڑھنا شروع کیا۔ اسلامیہ ہائی سکول میں ادبی ماحول یوں بھی تھا کہ ان دنوں وہاں اردو کے استاد سید بشیر حیدر کنول تھے۔ جو بہت اچھے شاعر اور گیت نگار تھے اور کئی زبانیں جانتے تھے اور اپنے عہد کے نابغہ روزگار اہلِ علم وفضل سے داد حاصل کر چکے تھے۔ ان کا مجموعہ کلام ''من کی بستی'' کے نام سے پروفیسر صادق زاہد مرحوم نے شائع کروایا تھا۔ پروفیسر صادق زاہد بشیر حیدر کنول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ان کی آمد سے ایبٹ آباد جیسے پسماندہ شہر میں علم وادب کی ایک نئی روح پیدا ہوگئی۔ جس کی وجہ سے اسلامیہ ہائی سکول ایبٹ آباد علم و ادب اور دیگر ملی جدوجہد آزادی کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔''(۱۲)

یوں سلطان سکون اور ان جیسے سارے دوسرے طلباء کے ذہنوں کی آبیاری کے لیے یہ انتہائی سازگار ماحول تھا۔ پھر سلطان سکون کی محکمہ تعلیم میں سروس کے دوران جب گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں تعیناتی ہوئی تو یہاں شعروادب کا ذوق خوب پروان چڑھا وہاں اس وقت صوفی عبدالرشید اور آصف ثاقب موجود تھے۔ ممتاز منگلوری گورنمنٹ کالج کے طالب علم تھے جو کبھی کبھی سلطان سکون کے پاس دفتر

میں آکر بیٹھ جاتے اور شعر و ادب کے موضوع پر نہ صرف گفتگو ہوتی بلکہ ہر دو حضرات ایک دوسرے کو اپنی نظمیں غزلیں دکھاتے اور ان پر گفتگو بھی ہوتی ۔ یوں شعر کہنا اور غزلوں کو شائع کرنے کا مرحلہ بھی آ گیا اس حوالے سے سلطان سکون کچھ یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

''جب میں محکمہ تعلیم میں ملازم تھا تو ان دنوں ایبٹ آباد سے ایک ہفت روزہ ''جمہور'' شائع ہوا کرتا تھا جس کے مدیر غلام جان طاہر خیلی تھے، انھوں نے اس میں ہفت روزہ طرحی مشاعروں کی بنا ڈالی یہ ۵۸۔۱۹۵۷ کا دور تھا میں نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کیا محکمہ جنگلات کے ایک سپرنٹنڈنٹ عارف بٹالوی ان غزلوں کی اصلاح کرتے تھے اور پھر وہ شائع ہوتی تھیں ۔'' (۱۳)

یہاں سے سلطان سکون کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا اور پھر مختلف اخبارات و رسائل میں ان کی غزلیں شائع ہونا شروع ہوئیں شروع میں ان کا تخلص بلاکش تھا اور وہ سلطان محمد بلاکش کہلاتے تھے ۔ جمہور اور کچھ دوسرے اخبارات و رسائل میں ان کی ابتدائی غزلیں ''بلاکش'' تخلص کے ساتھ ہی شائع ہوئیں ۔ تخلص کے حوالے سے ان کا خیال یہ تھا کہ وہ ایسا ہو جو کسی دوسرے شاعر کا نہ ہو ۔ اس لیے انھوں نے بلاکش جیسا منفرد تخلص اختیار کیا لیکن بعد ازاں وہ سلطان محمد بلاکش سے سلطان سکون ہو گئے ۔ اس حوالے سے انھوں نے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ یہ احمد ندیم قاسمی اور چند دوسرے شعرا کے کہنے کے بعد اختیار کیا گیا جس کی تفصیل یوں ہے:

''ایبٹ آباد کالج میں مشاعرہ تھا جس میں پورے ملک سے شعراء آئے ہوئے تھے یہ ۱۹۶۰ء کی بات ہے دوسرے دن میں نے پشاور جانا تھا لیکن میں راولپنڈی والی جی ٹی ایس میں سوار ہوا کیوں کہ اس میں احمد ندیم قاسمی حبیب جالب، احسان دانش اور شوکت تھانوی بھی سوار تھے اور انھی کی وجہ سے پشاور کی بجائے راولپنڈی کی گاڑی میں سوار ہوا ۔ راستے میں ان سے تعارف ہوا اور میں نے اپنا تعارف سلطان محمد بلاکش کے نام سے کرایا تو ان حضرات نے خوشی کا اظہار کیا اور ساتھ ہی اپنا تخلص تبدیل کرنے کا مشورہ بھی دیا یوں میں نے اس حوالے سے غور شروع کر دیا اور پھر ایک دن گورنمنٹ کالج میں بیٹھے بیٹھے میرے ذہن میں سکون کا لفظ آ گیا اور یوں میں نے یہی تخلص اختیار کیا ۔'' (۱۴)

سلطان سکون نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا یہ قیام پاکستان سے صرف ایک دہائی بعد کی بات ہے لیکن اس وقت تک یہاں اچھا خاصا علمی و ادبی ماحول بن چکا تھا یہاں شعرا اور ادیبوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہو چکی تھی۔ معروف شاعر پروفیسر شوکت واسطی بطور لیکچرار گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد میں آ چکے تھے اور انھوں نے اپنے احباب کے ساتھ مل کر یہاں علمی اور ادبی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا بلکہ اس حوالے سے ایک تنظیم کی بنیاد بھی رکھی گئی جس کا نام شروع میں ''ایبٹ آباد لٹریری سوسائٹی'' رکھا گیا اور بعد ازاں ''بزمِ علم و فن'' کے نام سے اس نے بے پناہ شہرت حاصل کی اور کل پاکستان مشاعرے ، مذاکرے اور ورائے وغیرہ منعقد کروائے اس حوالے سے پروفیسر شوکت واسطی لکھتے ہیں کہ:

''بزمِ علم و فن کے زیرِ اہتمام جو جلسے ماہ بہ ماہ ترتیب دیے گئے ان کا مفصل ذکر کیا جائے تو الگ ایک پوری کتاب چاہیے موقع محل کی مناسبت سے بڑے پیمانے پر قومی ، مذہبی ، ادبی و علمی ، فنی ہر رنگ کی محفل جمتی تھی۔''(۱۵)

یہ محفلیں اس وقت تک کے لکھنے والوں کے لیے بہترین تربیت گاہ کا کام کر رہی تھیں اور اسی وجہ سے اس وقت ایبٹ آباد میں اچھی خاصی علمی و ادبی فضا بن چکی تھی۔ جہاں نامی گرامی شعراء اور ادیب اپنی بساط کے مطابق فروغِ علم میں کوشاں تھے اسی ماحول میں سلطان سکون نے شاعری کا آغاز کیا اور آہستہ روی سے وہ شاعروں اور ادیبوں کی اس کہکشاں کا حصہ بن گئے۔ جو یہاں کی علمی و ادبی فضا کو دن بہ دن بہتر سے بہتر بنا رہی تھی اور بزرگ شعراء کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد یہاں ابھرنا شروع ہو چکی تھی۔ سلطان سکون نے جن لوگوں کی موجودگی میں اپنا ادبی سفر شروع کیا ان میں حفیظ اثر ، آصف ثاقب ، سید مبارک شاہ ، اکمل گیلانی ، صوفی عبدالرشید اور پروفیسر افضل مرزا شامل ہیں۔ اس کے بعد دوسرے دور میں نیاز سواتی ، عبداللہ یزدانی ، حاکم علی حاکم ، ناصر نقوی ، منظور سہیل ، پروفیسر صادق زاہد ، سیکھی میرٹھی ، یحییٰ خالد اور شوکت رضوی (جو ترنم سے اپنا کلام سنایا کرتے تھے) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ایک طرف بزمِ علم و فن اور چند ایک دوسری تنظیمیں کام کر رہی تھیں اور دوسری طرف سلطان سکون کے ہم عصر مقامی شعراء و ادیب بھی شام کو مل بیٹھتے اور شعر و ادب کی محفلیں ہوتیں۔ یہ لوگ ایک کیفے میں جمع ہوتے جس کا نام ''ایور گرین'' تھا۔ یہاں ایک دوسرے سے کلام بھی سنا جاتا اور مختلف علمی و ادبی موضوعات پر مباحث بھی ہوتے۔

سلطان سکون نے جب شاعری کا آغاز کیا تو وہ عبدالحمید عدمؔ سے بہت متاثر تھے اور انھوں نے عدمؔ کا تقریباً سارا ہی کلام پڑھ لیا تھا وہ اکثر گورنمنٹ کالج لائبریری سے عدمؔ کی کتابیں لے کر پڑھتے تھے غربت کا دور تھا کتابیں خریدنا تو ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی اس لیے لائبریری ہی آسرا تھا۔ سلطان سکون کو کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا انھیں عدمؔ کی کتاب "خرابات" بہت پسند آئی۔ خرید تو نہیں سکتے تھے لہٰذا انھوں نے لائبریری سے نکلوائی اور پوری کی پوری کتاب اپنے پاس لکھ لی۔ اس حوالے سے سلطان سکون نے بتایا کہ:

"مجھے عبدالحمید عدمؔ بہت پسند تھے اور میں نے عدمؔ کو پڑھنا شروع کیا تو ایک ایک کر کے ان کے تمام دستیاب مجموعے پڑھ لیے کتاب خریدنے کی استطاعت نہیں تھی۔ اس لیے کالج کی لائبریری سے ان کا مجموعہ "خرابات" لے کر سارے کا سارا اپنے پاس ڈائری میں لکھ لیا جو کہ آج تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اسی طرح میں نے سیف الدین سیفؔ کی پوری کتاب ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کی اور اس کے لیے باقاعدہ ٹائپنگ سیکھی۔" (۱۶)

عدم کے حوالے سے سلطان سکون نے کہا تھا کہ:

مل بھی سکتے عدمؔ سے کاش سکونؔ
غائبانہ ہی دل مرید ہوا

عبدالحمید عدم کے علاوہ ان کے پسندیدہ شعراء میں سیف الدین سیف، باقی صدیقی، مجید امجد، مصطفیٰ زیدی، قتیل شفائی، احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز شامل ہیں۔

سلطان سکون نے ان سب شعراء کو بالخصوص پڑھا اور ان میں سے ہر ایک سے اکتساب فیض کیا۔ تاہم عبدالحمید عدم آج بھی ان کے سب سے پسندیدہ شاعر ہیں۔ وہ اس پر افسوس کرتے ہیں کہ عدم کو وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے اور یہ عدم ہی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ یہ ہمارے معاشرے کا عمومی المیہ ہے کہ یہاں بڑے بڑے شعراء کو ان کے عہد میں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے نظیر اکبرآبادی جیسے بے مثل شاعر کو بہت زمانوں بعد دریافت کیا گیا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ جس شاعر میں، جس فنکار میں دم خم ہو وہ کسی نہ کسی زمانے میں اپنا آپ ضرور منوا لیتا ہے۔

سلطان سکون نے شاعری کے ساتھ ساتھ ہزارہ میں ادبی تنظیم سازی کے عمل میں بھی اپنا حصہ شامل کیا وہ جب شام کو دوستوں کے ساتھ مل بیٹھتے اور شعر و ادب کی محفل ہوتی تو وہیں انھیں ادبی تنظیم بنانے کا خیال آیا اور یوں انھوں نے ایک بزم کی بنیاد رکھی جس کی تفصیل میں وہ لکھتے ہیں:

''دوستوں کے مشورے سے ایک بزم کی بنیاد رکھی گئی جس کے صدر حفیظ اثر نامزد ہوئے باقی عہدیداروں کے نام یاد نہیں بزم کا نام ''بزمِ اہلِ قلم'' میں نے ہی تجویز کیا۔ ہاں اس کے سیکرٹری نشر و اشاعت نیاز سواتی تھے۔''(۱۷)

اس بزم نے ہزارہ میں فروغِ ادب کے لیے کافی کام کیا اور اس کی سرگرمیوں کی روداد یں نیاز سواتی باقاعدگی سے اخبارات کو بھیجا کرتے تھے یہ تنظیم کافی عرصہ تک فعال رہی پھر بوجوہ سلطان سکون ور آصف ثاقب اس سے علاحدہ ہو گئے۔ اور بعد ازاں سلطان سکون نے بزمِ شعور قائم کی جس میں شاہنواز سواتی اور شیراز کیانی بھی شامل ہو گئے۔ یہ دور ہزارہ میں شعر و ادب کے حوالے سے بڑا سنہرا دور شمار ہوتا ہے۔ اس عرصہ میں کئی ادبی تنظیمیں بزمِ علم و فن، بزمِ اردو، انجمن ترقی اردو، حلقہ احباب اور کئی یگر تنظیموں نے تسلسل سے یہاں مشاعرے اور دیگر ادبی تقریبات منعقد کیں جن میں اس وقت کے جید علمائے ادب شرکت کرتے تھے اور نوجوانوں کی علمی و ادبی تربیت کا کام بھی ہوتا تھا۔

سلطان سکون نے ایسے ہی زرخیز علمی و ادبی ماحول میں اپنے دور کے نامی گرامی شعراء کی موجودگی میں شاعری کی اور اپنے معاصرین و مشاہیر سے خوب داد و تحسین حاصل کی۔ ایک طرف مشاعروں کے ذریعے ان کا کلام عوام کے دلوں کو چھو رہا تھا تو دوسری طرف علمی و ادبی رسائل میں ان کی غزلیں شائع ہونا شروع ہو چکی تھیں ان کا کلام اپنے وقت کے اہم ادبی رسائل کی زینت بنتا رہا۔ بالخصوص احمد ندیم قاسمی کے ''فنون'' میں تو ان کی غزلیں اکثر شائع ہوتی تھیں۔ اسی طرح ان کے خطوط بھی شائع ہوتے تھے اور وہ تخلیقات پر اپنی رائے دیتے تھے ان کی شاعری کے مداحوں میں اس وقت کے اہم شعراء بھی شامل تھے۔ شاہنواز سواتی مظفر آباد کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہیں جس کی صدارت نامور شاعر منیر نیازی کر رہے تھے اور نظامت کے فرائض افتخار مغل انجام دے رہے تھے بقول شاہنواز سواتی:

''مظفر آباد میں مشاعرہ تھا اور منیر نیازی صدارت کر رہے تھے افتخار مغل نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے منیر نیازی مشاعرے سے اٹھ کر کہیں جانے لگے تو افتخار مغل سے کہا کہ جب تک میں واپس نہیں آتا سلطان سکون کو نہیں بلانا۔''(۱۸)

اور یہ مقام و مرتبہ یوں ہی حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے مسلسل محنت اور ریاضت درکار ہے اور بلاشبہ سلطان سکون نے اپنا سفر بہت آہستگی سے شروع کیا اور پھر مسلسل محنت اور کاوش سے اپنے وقت کے اہم شعراء میں شمار ہوئے۔ انھوں نے کسی شاعر سے باقاعدہ اصلاح نہیں لی بلکہ اپنی ذاتی محنت سے فنِ شاعری میں مقام حاصل کیا۔ انھوں نے نہ صرف اردو شاعری میں ایک اہم مقام حاصل کیا بلکہ اپنی محنت اور اپنے شوق کی وجہ سے ہندکو زبان و ادب کو ثروت مند کیا ہندکو زبان و ادب کے حوالے سے ان کا کام اولیت کا حامل ہے۔ انھوں نے ہندکو زبان کے ادبی سرمائے کو یکجا کرنے کی طرح ڈالی اور زبان کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے اس کے الفاظ و محاورات اور ضرب الامثال کو مرتب کیا۔ ہندکو زبان کے حوالے سے ان کا سب سے عظیم کارنامہ "ہندکو اردو لغت" ہے۔ جو اس حوالے سے اوّلین کاوش ہے اور اولیت کا یہ فخر ان سے کوئی چھین نہیں سکتا، انھوں نے لغت نویسی جیسے کٹھن مرحلے کو تنہا انجام دیا ہے اور یوں دو زبان و ادب کے ان مشاہیر میں شامل ہو گئے ہیں جنھوں نے مختلف لہجوں کی لغات مرتب کر کے زبانوں کو آنے والی نسلوں تک کے لیے محفوظ کر لیا سلطان سکون کی پہلی ہندکو اردو لغت کے علاوہ اردو اور ہندکو کی اب تک تیرہ تصانیف و تالیفات سامنے آ چکی ہیں۔ جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔ یہاں ان کتابوں کے نام اور سنِ اشاعت درج کیے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل اور توضیحی اشاریہ آگے آئے گا۔

۱۔ بجھ میری بجھارت (ہندکو پہیلیاں) ۱۹۸۷ء

۲۔ چنو چودھویں رات (ہندکو پہیلیاں) ۱۹۹۳ء

۳۔ کاری دی گل (ہندکو لوک کہانیاں) ۱۹۹۳ء

۴۔ ہندکو ضرب الامثال (ہندکو کہاوتیں اور محاورے) ۱۹۹۹ء

۵۔ کوئی خواب ہے نہ خیال ہے (اردو شعری مجموعہ) ۲۰۰۱ء (گولڈ میڈل)

۶۔ تارا لوئی والا (ہندکو ماہیے) ۲۰۰۱ء (گولڈ میڈل)

۷۔ ہندکو اردو لغت (پہلی ہندکو اردو لغت) ۲۰۰۲ء (گولڈ میڈل)

۸۔ سوچ رت (منتخب شعراء کی غزلوں کا انتخاب اور مختصر تعارف) ۲۰۰۲ء

۹۔ دلسوجھے (ہندکو شعری مجموعہ) ۲۰۰۸ء (اکادمی ادبیات انعام یافتہ)

۱۰۔ کوزے بیچ دریا (ہندکو کہاوتیں اور محاورے) ۲۰۰۹ء (گولڈ میڈل)

۱۱۔ کوئی ہے (اردو شعری مجموعہ) ۲۰۱۳ء

۱۲۔ کوئی جستا دکھائی دے   (اردو شاعری۔نظمیں۔قطعات)۲۰۱۶ء

۱۳۔کچھ پھول عقیدت کے   (منظومات)   ۲۰۱۸ء

سلطان سکون کی مطبوعہ کتب کے علاوہ موضوعاتی نظموں کی ایک کتاب زیرِ طبع ہے جبکہ ان کی ابتدائی شاعری کی دو بیاضیں ،ذاتی نظموں کے فائل ۔دوستوں اور عزیزوں کے حوالے سے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے۔ان خطوط کے علاوہ کتابوں پہ لکھے گئے فلیپ ،دیباچے اور تقریبات میں پڑھے گئے مضامین یہ سب غیر مطبوعہ ہیں دوستوں اور احباب کی طرف سے لکھے گئے ہزاروں کی تعداد میں خطوط ہیں کچھ عرصہ پہلے انھوں نے ''شعر وسخن'' مانسہرہ میں کچھ شعراء اور ادیبوں کے حوالے سے یادداشتیں بھی سپردِ قلم کیں۔

اعزازات:

سلطان سکون کے فن کے اعتراف میں انھیں ان اعزازات سے نوازا گیا۔

۱۔تیسرا انعام،مقابلہ کل پاکستان فیملی پلاننگ،نظم نگاری،۱۹۷۴ء

۲۔سندِ اعتراف،انجمن ترقی اردو،لاہور،محبانِ اردو،۱۹۸۲ء

۳۔پہلا انعام وسندِ اعتراف،اباسین آرٹس کونسل پشاور،کتاب بجھ میری بجھارت، ۱۹۸۶۔۸۷ء

۴۔سندِ اعتراف،وزارتِ آرٹس اینڈ کلچر موریطیس شمالی افریقہ،عالمی اردو کانفرنس مندوب پاکستان وفد ۱۹۹۱ء

۵۔ادبی ایوارڈ،ایگفا کلر،اردو شاعری،۱۹۹۷ء

۶۔ادبی ایوارڈ،کوڈک فلم،اردو شاعری،۲۰۰۰ء

۷۔ایوارڈ سندِ اعتراف،اباسین آرٹس کونسل پشاور،اردو شعری مجموعہ کوئی خواب ہے نہ خیال ہے ۲۰۰۱ء

۸۔سندِ اعتراف،سرحد آرٹس سوسائٹی صوبہ سرحد خوبصورت شخصیت،ہردلعزیز شاعر ۲۰۰۲۔۲۰۰۱ء

۹۔ادبی ایوارڈ،پاکستان ہندکو ادبی بورڈ پشاور،خدمات ہندکو زبان وادب ۲۰۰۲ء

۱۰۔ادبی ایوارڈ،پاکستان ٹیلنٹ کونسل ایبٹ آباد،اردو شاعری،۲۰۰۲ء

۱۱۔ادبی ایوارڈ،پاکستان مرکزی ہندکو بورڈ پشاور،خدمات ہندکو،۲۰۰۲ء

۱۲۔ سائیں احمد علی ادبی ایوارڈ، اباسین آرٹس کونسل پشاور، ہندکو کتاب تارالوئی والا ۲۰۰۲ء

۱۳۔ فارغ بخاری ادبی ایوارڈ، اباسین آرٹس کونسل پشاور، ہندکو اردو لغت ۲۰۰۲۔۰۳ء

۱۴۔ ادبی ایوارڈ، حمید نظامی ایوارڈ، اردو شاعری، ۲۰۰۳ء

۱۵۔ ادبی ایوارڈ، ادارہ فروغ ہندکو پشاور، خدمات ہندکو ادب، ۲۰۰۳ء

۱۶۔ شیلڈ، گندھارا ہندکو ادبی بورڈ پشاور، پہلی ہندکو اردو لغت، ۲۰۰۳ء

۱۷۔ ادبی ایوارڈ، ماڈرن ایج پبلک سکول و کالج ایبٹ آباد، اعتراف ادبی خدمات، ۲۰۰۳ء

۱۸۔ ادبی ایوارڈ، ہزارہ آرٹس اینڈ کلچر سوسائٹی اسلام آباد، اردو شاعری ۲۰۰۳ء

۱۹۔ ادبی ایوارڈ، سدا بہار آرٹس سوسائٹی ایبٹ آباد، اعتراف ادبی خدمات، ۲۰۰۳ء

۲۰۔ ادبی ایوارڈ، راجا آرٹس کونسل ایبٹ آباد، اعتراف ادبی خدمات، ۲۰۰۳ء

۲۱۔ ادبی ایوارڈ، نیشنل ٹیلنٹ کونسل ایبٹ آباد، اعتراف ادبی خدمات، ۲۰۰۳ء

۲۲۔ سائیں احمد علی ادبی ایوارڈ، گندھارا ہندکو بورڈ پشاور، اعتراف ادبی خدمات ۲۰۰۵ء

۲۳۔ خواجہ عبدالرحمان چھوہری ادبی ایوارڈ، حلقہ فروغ ادب سرحد، پنجاب،

اعتراف ادبی خدمات ۲۰۰۶ء

۲۴۔ سند اعتراف و نقد انعام ۲۵۰۰۰ ہزار روپے دی بینک آف خیبر پشاور،

اعتراف ادبی خدمات ۲۰۰۶ء

۲۵۔ ادبی ایوارڈ، ایوب میڈیکل کالج ایبٹ آباد اعتراف ادبی خدمات ۲۰۰۶ء

۲۶۔ ادبی ایوارڈ شعبہ اردو جامع پشاور بسلسلہ جشن آزادی، اعتراف ادبی خدمات، ۱۴ اگست ۲۰۰۷

۲۷۔ ادبی ایوارڈ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ایبٹ آباد، اعتراف ادبی خدمات ۲۰۰۹ء

۲۸۔ ادبی ایوارڈ و نقد انعام پانچ ہزار روپے، اباسین آرٹس کونسل پشاور، ہندکو شعری مجموعہ

''دلسو تھے'' ۲۰۰۹ء

۲۹۔ ادبی ایوارڈ ایک لاکھ روپے نقد اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ہندکو شعری مجموعہ

''دلسو تھے'' ۲۰۱۰ء

۳۰۔ فارغ بخاری ادبی ایوارڈ، اباسین آرٹس کونسل پشاور، ہندکو کتاب ''کوزے بچ دریا'' ۲۰۱۱ء

گولڈ میڈلز:

۱۔ گولڈ میڈل اباسین آرٹس کونسل پشاور اردو مجموعہ "کوئی خواب ہے نہ خیال ہے" ۲۰۰۱ء

۲۔ گولڈ میڈل، اباسین آرٹس کونسل پشاور، ہندکو اردو لغت ۲۰۰۲ء۔

۳۔ گولڈ میڈل، اباسین آرٹس کونسل پشاور، ہندکو کتاب "تار و لوئی والا" ۲۰۰۲ء۔

۴۔ گولڈ میڈل (خالص) ٹوڈ ہلیوز سوشل ویلفیئر آرگنائزیشن ایبٹ آباد دلسو تھے ۲۰۰۹ء۔

۵۔ صدارتی تمغہ حسن کارکردگی، صدر پاکستان، ادبی خدمات ۲۰۱۴ء۔

اعترافِ فن (مقالہ جات):

۱۔ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو، آنسہ روبینہ گل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ایبٹ آباد ۲۰۰۵ء۔

۲۔ تحقیقی مقالہ برائے ایم اے اردو قدرت اللہ خٹک پشاور یونیورسٹی پشاور ۲۰۰۷ء۔

۳۔ تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو شبیر احمد قرطبہ یونیورسٹی پشاور ۲۰۱۵ء۔

سلطان سکون روڈ:

سلطان سکون کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر شہری اتحاد تنظیم ایبٹ آباد نے ان کے گھر کی طرف جانے والی کہیال روڈ کو ان کے نام سے منسوب کرنے کے لیے صوبائی حکومت سے منظوری لی اور یوں ۳۰ جولائی ۲۰۱۶ء کو ایک پروقار تقریب میں اس وقت کی ڈپٹی کمشنر ایبٹ آباد عمارہ عامر خٹک نے سلطان سکون روڈ کا افتتاح کیا۔ عمائدین شہر نے سلطان سکون کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈالی اور انھیں ان کی ادبی خدمات پر بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔

مشاغل زندگی:

سلطان سکون کی زندگی کچھ زیادہ متنوع مشاغل کی حامل نہیں رہی بلکہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مشغلہ علم و ادب رہا۔ یہی ان کا اوڑھنا بچھونا رہا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ علم و ادب میں صرف کیا۔ کتابیں اخبارات و رسائل، مطالعہ، شعر و ادب کے حوالے سے آڈیو کیسٹس کی جمع آوری بھی ان کا مشغلہ رہا۔ انھوں نے اپنی آمدن سے کتب و رسائل کی خریداری کا حصہ مقرر کیا ہوا تھا اور ان کے

پاس کتابوں اور رسائل کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوا۔ وہ قلمی و غیر قلمی رسائل و ادبی اخبارات سے کاٹ کر نوادرات جمع کرتے رہے۔ ان کے ذخیرے میں "شمع" دہلی، ماہنامہ "نقاد"، ماہنامہ "رومان" کراچی، ماہنامہ "ڈائریکٹر" اور "شباب" لاہور سمیت بہت سارے رسائل میں شائع شدہ غزلوں، نظموں اور افسانوں پر مشتمل تین جلدیں شامل ہیں۔

بہت سارے مقامی و غیر مقامی شاعروں کے آڈیو کیسٹس اور تصویری البم ان کے پاس محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ مقامی شعراء کے شائع شدہ کلام (غزلیات) کے دو البم، دنیا کے عجیب و غریب اور ناقابلِ یقین واقعات پر مبنی چار البم۔

مقامی اخبارات و رسائل مثلاً "جمہور" اور "نشیمن" وغیرہ کے کئی فائل ان کے پاس محفوظ ہیں۔ پاکستان بھر سے شائع ہونے والے ادبی رسائل مثلاً "فنون، الحمراء، تخلیق، بیاض، پرواز، لندن، ماہِ نو، چہار سو، شعر و سخن" اور کئی دوسرے رسائل کے سینکڑوں شمارے ان کے ذخیرے کا حصہ ہیں۔ سلطان سکون نے کچھ ہی عرصہ پہلے اپنی کتابوں اور علمی و ادبی رسائل کے کئی ضخیم نمبر ماڈرن ایج پبلک سکول و کالج کی لائبریری کو عطیہ کر دیے ہیں۔ سلطان سکون نے ساری زندگی کتابیں جمع کیں۔ انھیں شروع ہی سے کتابیں لینے کا شوق تھا۔ اس وقت سے جب خریدنے کی استطاعت بھی نہیں ہوتی تھی، ان کی کتابوں سے لگاؤ اور محبت کے حوالے سے ایک واقعہ انھوں نے سنایا کہ:

> "میں ورائٹی بک سٹال پر گیا جہاں مجھے احمد فراز کا مجموعہ "نایافت" نظر آیا۔ میرے پاس کتاب خریدنے کے پیسے نہیں تھے صرف ایک پرائز بانڈ تھا میں نے جھجکتے ہوئے ورائٹی بک سٹال کے مالک سے کہا کہ مجھے یہ کتاب دے دیں اور یہ پرائز بانڈ رکھ لیں وہ کہنے لگے کہ اس کی تو ابھی قرعہ اندازی ہونا ہے، ممکن ہے آپ کا بانڈ نکل آئے۔ میں نے کہا جناب اس سے زیادہ عزیز مجھے یہ کتاب ہے اور یوں میں نے وہ بانڈ دے کر احمد فراز کی کتاب خرید لی۔" (۲۱)

جیسا کہ عبدالحمید عدمؔ سلطان سکون کا پہلا پسندیدہ شاعر ہے، اس حوالے سے عدم کے ۳۳ مجموعے ان کی لائبریری میں موجود ہیں جو سلطان سکون نے مارکیٹ سے خریدے۔

شخصیت:

سلطان سکون انتہائی سادہ لوح اور درویش صفت انسان ہیں۔ اپنی روایات کے پاسدار اور اپنے اسلاف کی شرافت کا عملی نمونہ وہ ایک سچے انسان ہیں اور انھیں دکھاوے اور بناوٹ سے سخت نفرت ہے وہ جو کچھ ظاہر ہیں وہی ان کا باطن بھی ہے۔ انھیں قول و فعل کے تضاد سے سخت نفرت ہے۔ دنیاوی لالچ سے بے نیاز اپنے کام میں مسلسل محنت اور لگن سے انھوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی ہے۔ یہی وجہ ہے انھیں مشاہیر ادب سے بھی داد ملی ہے اور ان کے معاصرین بھی انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کے درویشانہ طرز زندگی کی قدر کرتے ہیں۔ پروفیسر صادق زاہد، سلطان سکون کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''سلطان سکون بحیثیت انسان انتہائی مخلص، سادہ لوح اور شعر و ادب کے رسیا انسان ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی اپنے ایک مخصوص انداز میں بسر کی ہے۔ جس میں شعر و ادب سے بے انتہا لگن اور درویشانہ رکھ رکھاؤ کے علاوہ دیگر کسی دکھاوٹ یا نمائش کا قطعاً کوئی گزر نہیں۔ سلطان سکون نے اس مادیت پرستی کے دور میں اہلِ دانش کی لاج قائم رکھی ہے اور ان سے کبھی کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی جس سے یہ اندازہ ہو کہ وہ پیشہ ور دانشوروں کی طرح اپنے فن کو تجارت کا مال اور مالی منفعت کے حصول کا ذریعہ بنا رہے ہوں یا وہ کسی انجمن ستائش باہمی کے رکن ہوں۔ سلطان سکون نے نہایت سادہ زندگی بسر کرنے کا شعار اپنایا جس پر وہ شروع سے آج تک پورے اعتماد و استحکام سے قائم و دائم ہیں۔'' (۲۲)

سلطان سکون نے بڑے خلوص کے ساتھ شعر و ادب کی خدمت کی ہے۔ انھوں نے نام و نمود کی پرواہ کیے بغیر مسلسل کوشش جاری رکھی ہے کہ اپنا حصہ ڈال سکیں۔ سلطان سکون نے کٹھن سے کٹھن مرحلے کو بھی خندہ پیشانی سے جھیلا ہے اور کبھی کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ بلکہ اپنی خودداری کو ہر صورت قائم رکھا وہ آج بھی نہایت سادہ زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کی شاعری میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کا یہ شعر دیکھیں:

کڑے دنوں کے مقابل ڈٹے رہے تنہا
کسی سے دستِ تعاون کی التجا نہیں کی

(کوئی خواب ہے نہ خیال ہے، ص ۱۱۰)

ان کی زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے انسانیت کی قدر و قیمت کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے۔انھوں نے زندگی کی تلخیوں کو صبر و تحمل سے برداشت کیا ہے اور کبھی نارسائی کا گلہ نہیں کیا بلکہ مطمئن زندگی گزاری ہے۔زندگی کی تلخیوں کو اپنی شاعری کی فضاء سے الگ رکھا ہے اور وہ تلخی ان کے ہاں دکھائی نہیں دیتی اور یہ بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ کوئی کڑے وقت میں تلخ نہ ہو۔ڈاکٹر نذیر تبسم ان کی شخصیت کے اس پہلو پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

> ''بہترین شعری صلاحیتیں رکھنے کے باوجود مادی اعتبار سے محرومیوں کی راہ پر چلنے والا سلطان سکون اپنی ذات میں درویش نہ ہوتا یا انسانی قدروں کے جمال نے ان کی شخصیت کو سیراب نہ کیا ہوتا تو شاید اس کے لہجے میں تلخی کے عناصر پیدا ہو جاتے اور پھر ان رویوں کا اظہار اس کی شاعری سے جھلکتا۔لیکن یہ ایک مثبت بات ہے کہ اس نے گرد آلود زمانے میں سانس لینے کے باوجود اپنا رویہ منفی نہیں ہونے دیا۔''(۴۳)

سلطان سکون کی زندگی کی یہی مثبت پیش رفت انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز کرتی ہے۔انھوں نے اپنے مشاہیر اور یہاں تک کے اپنے معاصرین کو بھی ہمیشہ اچھے الفاظ سے یاد کیا ہے۔مشاہیر سے بے لوث محبت کرتے ہیں اور ان کے ذکر سے ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔وہ کسی کو پریشانی میں نہیں دیکھ سکتے۔

سچائی اور راست بازی سلطان سکون کی شخصیت کا مستقل حصہ ہے انھیں جھوٹ سے نفرت ہے۔قول و فعل کے تضاد کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔

انھیں دیہات کی سادہ زندگی اور وہاں کا قدرتی ماحول بہت پسند ہے۔سلطان سکون حسن پرست ہیں اور حسن بھی وہ جو دائمی ہو۔

ان کی زندگی میں حسن ترتیب نظر آتا ہے اور وہ برسوں سے انتہائی نظم و ضبط سے اس کو قائم رکھے ہوئے ہیں انھوں نے جس قدرتی ماحول میں آنکھ کھولی وہ ان کی زندگی کا مستقل حصہ بن گیا۔اور ان کے جمالیاتی فہم کو اس نے ہمیشہ قائم دائم رکھا۔سلطان سکون گزشتہ کئی برسوں سے باقاعدہ اپنا ''روزنامچہ'' لکھ رہے ہیں۔ان کا یہ روزنامچہ ایک طرف ان کی ذاتی زندگی کے حالات و واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔تو دوسری طرف پچھلے ساٹھ ستر سال کے ادبی منظر نامے کو پیش کرتا ہے۔یوں اس روزنامچے سے نا صرف

ان کی ایک ضخیم آپ بیتی مرتب کی جا سکتی ہے بلکہ ہزارہ میں ادب کی تاریخ مرتب کرنے کا مستند حوالہ بھی ہے۔ ان کی پوری زندگی کا حاصل ہی علم و ادب ہے۔ کیوں کہ بھی عمر بھر ان کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ سلطان سکون کی زندگی کا مطالعہ آج کی نسل کے لکھنے والوں کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ کس طرح ایک عام آدمی اپنی مسلسل محنت، لگن اور خلوص سے زندگی میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ ان کی زندگی آنے والوں کے لیے ایک ایسا معیار ہے۔ جس کی مثالیں کم کم ہی نظر آتی ہیں انھوں نے اپنی مسلسل محنت سے اپنے معاصرین اور مشاہیر سے خوب داد و تحسین حاصل کی ہے اور اسی کو وہ اپنے لیے سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں انھیں زندگی میں بے پناہ محبتیں اور احترام ملا لیکن انھیں صرف ایک بات کا قلق ہے۔ جس کا اظہار انھوں نے ایک ملاقات میں یوں کیا کہ:

> "میں نے اپنی ساری زندگی شعر و ادب کی نظر کر دی میں نے خوب شہرت بھی حاصل کی اور مطمئن زندگی بھی گزاری لیکن ایک افسوس، ایک کسک ہے دل میں کہ اپنی اولاد کی حق تلفی کی ہے۔ میں نے ان کا بچپن نہیں دیکھا اور ان کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ان کو کبھی گود نہیں اٹھایا ان کو جس قدر پدرانہ شفقت کی ضرورت تھی۔ انھیں اس سے محروم رکھا کیوں کہ میں علم و ادب کو ہی سب سے مقدم سمجھتا رہا اور دن رات اسی میں لگا رہا۔ لہٰذا یہ احساسِ ندامت آج بھی دامن گیر ہے اور کبھی کبھی مجھے شدت سے گناہ گار ہونے کا احساس دلاتا ہے۔" (۲۳)

سلطان سکون نے بلاشبہ اپنی ساری زندگی علم و ادب کی نظر کر دی۔ اپنی جمع پونجی سے اپنی کتابیں شائع کراتے رہے کتابیں خریدتے رہے۔ ان کی کمائی حق حلال کی تھی۔ انھوں نے ہمیشہ رزقِ حلال کو ترجیح دی اور کبھی اپنے دامن کو دنیاوی لالچ سے آلودہ نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ غربت کے باوجود مطمئن زندگی گزاری۔ وہ آج بھی کرائے کے مکان میں رہتے ہیں لیکن یہاں انھیں ایک گونہ آسودگی حاصل ہے۔ انھیں اپنی اس حالت پر فخر ہے انھوں نے خود بھی ہمیشہ رزقِ حلال کمایا اور اپنی اولاد کو بھی ہمیشہ اس کی تلقین کی۔ انھوں نے اپنی اولاد کو تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمیشہ عمدہ تربیت بھی دی۔ انھیں زندگی کی اونچ نیچ، سرد و گرم سے آگاہ کیا انھیں مشکل سے مشکل حالات میں بھی اپنا وقار اور اپنی عزت قائم رکھنے کا درس دیا۔ انھوں نے خود بھی اپنی روایات کی پاسداری کی اور اپنے بچوں کو بھی اس پر عمل پیرا رہنے کا سبق دیا۔ سلطان سکون نے اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر ایک نظم لکھی جس میں اپنی بیٹی کو زندگی کا سلیقہ سکھانے کی

کوشش کی ہے۔اس کی بھرپور راہنمائی کی گئی ہے۔وہ ان کی شخصیت کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔بیٹی نیلم سلطان کی رخصتی کے موقع پر لکھی گئی یہ نظم بیٹیوں کے لیے مشعل راہ ہے:

خدا حافظ تیرا بیٹی خدا تیرا نگہباں ہو!
خوشی سے لمحہ بھر خالی نہ تیرے دل کا داماں ہو
ہم اپنے دل سے بیٹی تجھ کو رخصت کر نہیں سکتے
خدا کے حکم سے لیکن بغاوت کر نہیں سکتے
تیری فرقت کے دکھ سے دل ہمارے چور ہیں بیٹی
مگر تقدیر کے آگے بہت مجبور ہیں بیٹی
ہر اک بیٹی کو ماں اور باپ کا گھر چھوڑ جانا ہے
یہی دستور دنیا ہے یہی رسمِ زمانہ ہے
یہی وہ موڑ ہے راہ ہو گئی ہم سے جدا تیری
حقیقت میں ہوئی اب زندگی کی ابتداء تیری
یہی اب گھر تمھارا ہے یہی دنیا تمھاری ہے
یہی دریا یہی ساحل یہی نیّا تمھاری ہے
اب اس ماحول میں تجھ کو نئی دنیا بسانی ہے
یہی تیرا فسانہ ہے یہی تیری کہانی ہے
شریک زندگی کے ہاتھ میں اب ہاتھ دینا ہے
شریکِ زندگی کا زندگی بھر ساتھ دینا ہے
سسر اور ساس کی خدمت دل وجاں سے کیا کرنا
خوش اسلوبی سے ایسے سب فرائض کو ادا کرنا
بڑی چاہت سے شوہر کے بہن بھائیوں سے پیش آنا
مروت اور ہمدردی سے ہمسایوں سے پیش آنا
ہمیشہ دور رکھنا خود کو تو ان کی قرابت سے
چغل خوروں سے ،حاسد اور بد باطن کی صحبت سے

کسی بدگو کی باتوں پہ یقین ہرگز نہ کرنا تم
کوئی تہمت کسی اپنے پرائے پر نہ دھرنا تم
کوئی مشکل جو پیش آئے تو جی اپنا کڑا رکھنا
کوئی بھی مرحلہ ہو حوصلہ دل کا بڑا رکھنا
جو غم آئیں تو ہرگز شدتِ غم سے نہ گھبرانا
ملیں خوشیاں تو خوشیوں کی نہ سرحد سے گزر جانا
یہ دنیا ہے یہاں پر ایک سا عالم نہیں رہتا
سدا خوشیاں نہیں رہتیں ہمیشہ غم نہیں رہتا
کبھی شوہر سے کوتاہی بھی ہو صرفِ نظر کرنا
جو اس سے دکھ کوئی پہنچے تو ہنس کر درگزر کرنا
جو شکوہ ہو تو ہرگز ذکر مت اغیار سے کرنا
کسک بڑھ جائے تو اپنے کسی غم خوار سے کرنا
اگر ہے زندگی میں تجھ کو پھلنا پھولنا بیٹی
ہماری اس نصیحت کو کبھی مت بھولنا بیٹی
عمل کرنا سدا بیٹی ہماری اس نصیحت پہ
کرے گا اک زمانہ رشک تیرے گھر کی جنت پہ
خدا سے ہے دعا بیٹی ہمیشہ تم پھلو پھولو
سکون و چین کے بیٹی سدا تم جھولنے جھولو

(۱۷ستمبر۱۹۸۷ء)

یہ سلطان سکون کی وہ مشرقیت پسندی ہے جس کو انھوں نے خود بھی سینے سے لگائے رکھا اور اس کی تلقین اپنے بچوں کو بھی کی۔ یہ سلطان سکون کی شخصیت کی بہترین عکاسی کرتی ہے۔ اس کی مخاطب فقط ان کی بیٹی نیلم سلطان ہی نہیں بلکہ ہر بیٹی ہے۔ یہ سلطان سکون کی زندگی کا سب سے مضبوط اور روشن پہلو ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ سلطان سکون کی غیر مطبوعہ سوانح عمری

۲۔ سلطان سکون سے انٹرویو، بمقام گوشہ سکون کہیال، ایبٹ آباد، ۱۹ جون ۲۰۱۶ء

۳۔ سلطان سکون کی غیر مطبوعہ سوانح عمری

۴۔ سلطان سکون سے انٹرویو، بمقام گوشہ سکون کہیال، ایبٹ آباد، ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء

۵۔ سلطان سکون سے انٹرویو، بمقام گوشہ سکون کہیال، ایبٹ آباد، ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء

۶۔ سلطان سکون کی غیر مطبوعہ سوانح عمری

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً

۹۔ سلطان سکون سے انٹرویو، بمقام گوشہ سکون کہیال، ایبٹ آباد، ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء

۱۰۔ سلطان سکون کی غیر مطبوعہ سوانح عمری

۱۱۔ سلطان سکون سے انٹرویو ہفت روزہ اخبار خواتین، کراچی، ۳۰ ستمبر تا ۶ اکتوبر ۱۹۸۷ء

۱۲۔ صادق زاہد، پروفیسر: "تاثرات و تجربات"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۱۱

۱۳۔ سلطان سکون سے انٹرویو ہفت روزہ "لوح و قلم انٹرنیشنل"، ایبٹ آباد، ۲۰، ۲۶ مارچ تا یکم اپریل ۲۰۱۲ء

۱۴۔ سلطان سکون سے انٹرویو، بمقام گوشہ سکون کہیال، ایبٹ آباد، ۲۱ اکتوبر ۲۰۱۷ء

۱۵۔ شوکت واسطی: "کہتا ہوں سچ"، القلم دارالاشاعت، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۳۵

۱۶۔ سلطان سکون سے انٹرویو، بمقام گوشہ سکون کہیال، ایبٹ آباد، ۳ نومبر ۲۰۱۷ء

۱۷۔ سلطان سکون کی غیر مطبوعہ سوانح عمری

۱۸۔ شاہنواز سواتی سے انٹرویو، بمقام خیابان کشمیر، اسلام آباد، ۱۷ فروری ۲۰۱۸ء

۱۹۔ شاہنواز سواتی: "ماریشس میں سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس"، مشمولہ: ماہنامہ اخبار اردو، اسلام آباد، فروری ۱۹۹۳ء

۲۰۔ سلطان سکون کی ذاتی فائل سے

۲۱۔ سلطان سکون سے انٹرویو، بمقام گوشہ سکون کہیال، ایبٹ آباد، ۳ نومبر ۲۰۱۷ء

۲۲۔ صادق زاہد، پروفیسر: "تاثرات و تجربات"، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۰۹

۲۳۔ نذیر تبسم، ڈاکٹر: سرحد کے اردو غزل گو شعراء، بخاری پبلشرز، پشاور، ۲۰۱۶ء، ص ۴۰۷

۲۴۔ سلطان سکون سے انٹرویو، بمقام گوشہ سکون کہیال، ایبٹ آباد، ۱۳ فروری ۲۰۱۸ء

۲۵۔ سلطان سکون کی ذاتی فائل

تصانیف وتالیفات

بجھ میری بجھارت:

''بجھ میری بجھارت'' سلطان سکون کی پہلی تالیف ہے جو ہندکو زبان کی بجھارتوں (پہیلیوں) پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب پہلی بار جنوری ۱۹۸۷ء میں سلطان سکون نے ''جمہور پرنٹنگ پریس'' ایبٹ آباد سے شائع کرائی۔

اس کے کل صفحات ۹۷ ہیں اور اس کی قیمت ۱۵ روپے رکھی گئی۔ اس کتاب کے انتساب تین ہیں۔ پہلا انتساب سلطان سکون نے اپنی والدہ کے نام کیا ہے۔ دوسرا ان گمنام ہستیوں کے نام ہے جنھوں نے ہندکو لوک ادب تخلیق کیا اور تیسرا انتساب ان محترم احباب کے نام ہے جن کی آراء اس کتاب میں شامل ہیں۔ ان میں پروفیسر فارغ بخاری، رضا ہمدانی اور پروفیسر صوفی عبدالرشید کے نام شامل ہیں۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس سے کسی زبان کا ہر وہ شخص لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ جو اردو زبان جانتا ہو کیوں کہ اس میں سب سے پہلے ہندکو پہیلی دی گئی ہے۔ اس کے بعد اس کا اردو ترجمہ اور کتاب کے آخر میں ان پہیلیوں کے جوابات بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ یوں اس کی تفہیم ہر قاری کے لیے آسان کر دی گئی ہے۔ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے صوفی عبدالرشید لکھتے ہیں:

> ''آج ایک ایسی تالیف کے کتابت شدہ اوراق میرے سامنے ہیں جس نے ایک بھولے بسرے عہد کی یادیں ذہن میں تازہ کر دیں۔ دن بھر کی مشقت سے تھکے ہارے لوگ جب راتوں کو چراغ کے سہارے مل بیٹھتے تو یا تو قصے کہانی سے ایک دوسرے کا جی بہلاتے یا گیتوں سے دلوں کو گرماتے تفریح کا ایک ذریعہ پہیلی بھی تھی جس سے علاوہ تفریح کے ذہنی آزمائش بھی مقصود ہوتی تھی۔''(۱)

سلطان سکون کی یہ تالیف ان کی اپنی مادری زبان سے محبت کی دلیل ہے اور ان کا مقصد ہندکو ادب کے ذخیرے کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرنا ہے۔ اس کتاب میں ۱۵۰ پہیلیاں ہیں۔

''بجھ میری بجھارت'' کو اباسین آرٹس کونسل کی جانب سے پہلا انعام اور اس کے مرتب سلطان سکون کو سند اعتراف سے نوازا گیا۔

چنو چودھویں رات:

یہ سلطان سکون کی دوسری تالیف ہے اور یہ بھی ان کی پہلی کتاب کی طرح پہیلیوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب اگست ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی اور اس کی طباعت ایجوکیشنل پریس کراچی سے ہوئی۔ کتابت ایم اشرف نے کی اور اس کی قیمت ۵۰ روپے مقرر کی گئی۔ کتاب کا انتساب صوبہ سرحد (خیبر پختونخواہ) کی مشہور ادبی جوڑی پروفیسر فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کے نام کیا گیا ہے۔

اس میں کل ۹۸ بجھارتیں (پہیلیاں) ہیں جو کل ۶۵ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اس کتاب میں سلطان سکون کی پہلی کتاب ''بجھ میری بجھارت'' پر ملک بھر کے ادیبوں اور شعراء کی آراء درج ہیں۔ کراچی سے شبنم رومانی لکھتے ہیں:

''ان پہیلیوں میں پورا ہندکو کلچر سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔'' (۲)

پشاور سے فارغ بخاری نے رائے دی ہے کہ:

''پہیلی لوک ورثہ کی ایک نہایت مقبول صنف ہے اور ہندکو زبان کی اس صنف کی طرف سب سے پہلے سلطان سکون نے توجہ دے کر نہایت قابل قدر اقدام کیا ہے۔'' (۳)

لاہور سے مرزا ادیب کا خیال یوں سامنے آیا ہے کہ:

''سلطان سکون نے بڑے خلوص سے یکجہتی کی طرف قدم اٹھایا ہے۔ اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے کہ اس کے توسط سے ہمیں ہندکو کلچر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔'' (۴)

ہندکو ادب کے حوالے سے سلطان سکون کی یہ کتاب اس لیے بھی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ معدوم ہوتے ہوئے دیسی کلچر کو محفوظ کرنے کا باعث ہے اور اس کے ذریعے وہ لوگ بھی ہزارہ کی ثقافت کے

اس رنگ سے واقف ہوں گے جو ہندکو زبان نہیں جانتے۔ کتاب کا سرورق معروف مصور آفتاب ظفر کا بنایا ہوا ہے۔

کاری دی گل:

''کاری دی گل'' سلطان سکون کی تیسری ہندکو تالیف ہے جو دسمبر ۱۹۹۴ء میں ایبٹ آباد سے شائع ہوئی۔ ۱۶۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب کہانیوں، واقعات، لطیفوں اور ٹوٹکوں کا مجموعہ ہے۔ کتاب کی قیمت ۹۰ روپے ہے۔ اس کتاب کے دو انتساب ہیں۔ پہلا سلطان سکون نے اپنے والد کے نام کیا ہے جبکہ دوسرا ان اہل علم وفضل کے نام ہے جنھوں نے سلطان سکون کی حوصلہ افزائی کی اور کتاب کے حوالے سے اپنی آراء پیش کیں۔

کتاب میں جناب آصف ثاقب، صوفی عبدالرشید اور رضا ہمدانی کی آرا شامل ہیں۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں سلطان سکون نے ہزارہ ڈویژن میں بولی جانے والی ہندکو کے مختلف لہجوں کو بھی مثالوں سے واضح کیا ہے۔ آصف ثاقب اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ (ترجمہ):

> ''کاری دی گل تاریخ ہندکو ادب کے مکان کا وہ چمکدار روزن ہے۔ جس سے ذوق سلیم کی تازگی اور لفظوں کی چمک دمک سے سرشاری ہوگی۔''(۵)

ہندکو شاعری کے حوالے سے کافی کام ہو جانے کے بعد نثری ادب کا دامن کسی قدر خالی نظر آتا ہے تاہم سلطان سکون کی یہ کاوش لوگوں کی توجہ مبذول کرانے میں بڑی مدد ومعاون ثابت ہوگی۔

اس کتاب میں شامل کہانیاں، واقعات، لطائف اور ٹوٹکے جمع کرنا نہایت دشوار کام تھا لیکن اپنی زبان سے سچی لگن اور اس کی بقا کے جذبے نے سلطان سکون کو اس وقت طلب کام کی تکمیل پر آمادہ کیا اور انھوں نے بڑی محنت سے یہ سرمایہ جمع کیا۔

ہندکو ضرب الامثال:

''ہندکو ضرب الامثال'' سلطان سکون کی ہندکو سے محبت کی چوتھی دلیل ہے یعنی ان کی چوتھی ہندکو کتاب ہے۔ جس کی اشاعت ۱۹۹۹ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے ہوئی۔

یہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے ہندکو زبان کی کہاوتوں اور ضرب الامثال کا مجموعہ ہے دو سو اسی

(۲۸۰) صفحات پر مشتمل اس کتاب کے آغاز میں مقتدرہ قومی زبان کے سربراہ افتخار عارف کا پیش لفظ شامل ہے جبکہ صوفی عبدالرشید نے "خزینہ دار" کے عنوان سے اپنے مضمون میں سلطان سکون کی ہندکو زبان کے حوالے سے خدمات کو اجاگر کیا ہے۔ کتاب میں ۹۲ ضرب الامثال شامل کی گئی ہیں اور کتاب کے آخر میں سلطان سکون نے ہندکو زبان کے کچھ نئے الفاظ کی فہرست بھی دی ہے۔ کتاب کے حوالے سے صوفی عبدالرشید اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> "اصل دانش وہ ہے جو زندگی کے نوع بنوع تجربات اور گرم وسرد زمانہ سے گزرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ ضرب الامثال انھی تجربات حیات کے نتیجے میں وجود میں آتی ہیں۔ اس لیے لازم ہو جاتا ہے کہ ہم ان میں پوشیدہ معانی اور ان کے پس منظر سے بخوبی آگاہ ہوں۔ سکون صاحب بڑے سلیقے سے ہماری یہ ضرورت پوری کر رہے ہیں اور اس پر بجا طور پر استحقاق رکھتے ہیں کہ ہم سب اس خدمت کے لیے ان کے شکرگزار ہوں۔" (۶)

یہ کتاب بھی سلطان سکون کی مسلسل تلاش و جستجو کا بین ثبوت ہے۔ انھوں نے ہندکو زبان کے بہت بڑے ذخیرے سے نچوڑ کر یہ ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ جو بلا شبہ ہندکو زبان کی بڑی خدمت ہے کہ اس طرح کی کوئی مثال اس سے پہلے موجود نہیں ہے۔

کوئی خواب ہے نہ خیال ہے:

"کوئی خواب ہے نہ خیال ہے" سلطان سکون کی اردو شاعری کا پہلا مجموعہ ہے جو ۲۰۰۱ء میں اسلام آباد سے شائع ہوا۔ یہ سلطان سکون کی ۴ دہائیوں کی شعری ریاضت کا ثمر ہے۔ کتاب کا سرورق معروف مصور راجہ چنگیز سلطان نے بنایا ہے جبکہ پس ورق شاعر کی خوبصورت تصویر ہے جس کے نیچے جناب احمد ندیم قاسمی کی شاعر کے بارے میں رائے درج ہے۔

کتاب کا انتساب گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج ایبٹ آباد کے سابق صدر شعبۂ اردو عبدالقادر ساجد کے نام ہے۔

کتاب کے اندر اردو کے جید لکھاریوں کی آراء بھی شامل ہیں جن میں جناب احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، شبنم رومانی، محسن احسان، آصف ثاقب، صوفی عبدالرشید اور پروفیسر محمد ارشاد کے نام

شامل ہیں۔

سلطان سکون نے عام روش کے برعکس کتاب کے اولین صفحے پر ایک حمد اور اگلے صفحے پر نعت سے آغاز کیا ہے۔اس کے بعد کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔

''کوئی خواب ہے نہ خیال ہے'' غزلیات کا مجموعہ ہے۔جس کے بارے میں ڈاکٹر نذیر تبسم یوں اظہار خیال کرتے ہیں کہ:

> ''سلطان سکون کی شاعری کے بارے میں مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ روایت کا حسن لمحہ موجود میں گھل مل کر اپنی ایک پہچان بناتا ہے جو سلطان سکون کی شخصیت سے اتنا میل کھاتا ہے کہ دونوں ایک ہی پیکر میں ڈھلتے محسوس ہوتے ہیں۔''کوئی خواب ہے نہ خیال ہے'' یہ ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس کے ہر صفحے پر ایک سے زائد اچھے اور خوبصورت اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں اور یہ خوبی بہت کم شاعروں کے ہاں نظر آتی ہے۔''(۷)

سلطان سکون کی ہندکو بھارتوں کی پہلی کتاب کے آخر میں اس شعری مجموعے کا نام ''در دل پہ دستکیں'' درج ہے جو بعد میں ''کوئی خواب ہے نہ خیال ہے'' کے نام سے شائع ہوا۔

اس مجموعے میں ایک غزل ''نذر احمد فراز'' احمد فراز کی زمین میں کہی گئی ہے جس کا مقطع ہے۔

ہم وہ خوش فہم کہ اب بھی یہ سمجھتے ہیں سکون
''دوست ہوتا ہے ہر اک ہاتھ ملانے والا''

سلطان سکون نے حرف آغاز میں شاہنواز سواتی اور عبدالقادر ساجد کو اس مجموعے کی اشاعت کا محرک قرار دیا ہے۔

ایک سو بیس صفحات پر مشتمل اس مجموعے کو ۲۰۰۱ء میں اباسین آرٹس کونسل کی جانب سے سند اعتراف اور بعد ازاں طلائی تمغے سے بھی نوازا گیا۔

تارالوئی والا:

''تارالوئی والا'' سلطان سکون کی چھٹی کاوش ہے۔یہ کتاب دسمبر ۲۰۰۲ء میں ایبٹ آباد سے شائع ہوئی۔یہ ہندکو ماہیے کا مجموعہ ہے۔کتاب کی قیمت ۱۰۵ روپے رکھی گئی اور اس کا انتساب معروف

لوک فنکار ماسٹر حسین بخش کوثر کے نام ہے۔ ماسٹر حسین بخش کوثر کی پہچان ہندکو ماہیا تھی اس کی گائیکی میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کتاب کے آغاز میں سلطان سکون نے ماہیا کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''ماہیا زیادہ تر دیہات کی اکثر ان عورتوں یا دوشیزاؤں کی تخلیق ہے جو ظاہر ہے علم عروض سے قطعاً واقف نہیں مگر اس کے باوجود آپ دیکھیں تو ماہیے کے مصرے عموماً وزن میں ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ماہیا گائی جانے والی صنف سخن ہے۔''(۸)

اس مجموعے میں شامل کچھ ماہیے سلطان سکون نے ماضی کے لوک ادب کے ذخیرے سے اکٹھے کیے ہیں اور کچھ انھوں نے خود تخلیق کیے ہیں جنھیں درج ذیل عنوانات کے ذیل میں کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔

حمدیہ نعتیہ ماہیے

وطن دے ماہیے

عمومی ماہیے

ماہیے ہجلی دے

سکولی ماہیے

ماہیے یاراں دے

مخولی ماہیے

کتاب میں صوفی عبدالرشید کا ایک تعارفی مضمون ''میریا دے ماہیا!'' بھی شامل ہے۔ ''تارا لوئی والا'' کو ۲۰۰۲ میں اباسین آرٹس کونسل کی طرف سے سائیں احمد علی ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔ کتاب کے کل صفحات ۱۳۸ ہیں اور یہ آرٹ لنکس ایبٹ آباد سے شائع ہوئی۔

ہندکو اُردو لغت:

ہندکو اردو لغت سلطان سکون کا ہندکو زبان وادب کے حوالے سے ایک عظیم کارنامہ ہے یہ ہندکو زبان کی اولین لغت ہے ترتیب اشاعت کے حوالے سے یہ سلطان سکون کی ساتویں کاوش ہے۔ تاہم اس کی اہمیت اس لیے بہت زیادہ ہے کہ یہ سلطان سکون کی کئی برسوں کی ریاضت کا ثمر ہے۔ تقریباً

آٹھ ہزار (۸۰۰۰) الفاظ پر مشتمل یہ لغت ۲۰۰۲ء میں گندھارا ہندکو بورڈ پشاور سے شائع ہوئی یہ بڑے سائز کے ۲۵۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ''عرض حال'' کے زیر عنوان سلطان سکون نے لغت کے حوالے سے بھر پور معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ بعض ممکنہ اعتراضات کے جوابات دیے ہیں اور اپنے رفقا کا شکریہ ادا کیا ہے اور ان مشکلات و مسائل کا تذکرہ کیا ہے جو انھیں اس لغت کی ترتیب کے دوران پیش آئے ہیں۔

لغت کے حوالے سے صوفی عبدالرشید اور آصف ثاقب کے مضامین بھی شامل ہیں۔ جبکہ گندھارا ہندکو بورڈ کے سیکرٹری محمد ضیاء الدین کا ہندکو زبان کے حوالے سے تاثراتی مضمون ''خواہش'' بھی شامل اشاعت ہے۔ لغت کی اہمیت کو صوفی عبدالرشید ان الفاظ میں اجاگر کرتے ہیں کہ:

> ''ایک مستند لغت کے بغیر کوئی زبان اپنی علمی حیثیت نہیں منوا سکتی لغت کسی زبان کے جوہر کو سمجھنے اور پرکھنے کا سب سے بڑا وسیلہ ہے ہماری متعدد علمی، ادبی، لسانی، تعلیمی اور تدریسی ضروریات لغت سے وابستہ ہیں۔'' (۹)

اس لحاظ سے سلطان سکون کا یہ کارنامہ ہندکو زبان کی ایک ایسی خدمت ہے جس کے لیے ہر ہندکو بولنے والا ان کا ممنونِ احسان ہے۔ یہ کام انھوں نے اپنی ۲۵ برسوں کی ریاضت کے بعد مکمل کیا ہے۔ یہ کام اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ سلطان سکون کے سامنے ہندکو زبان کے حوالے سے لغت کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ اس عظیم علمی کارنامے پر سلطان سکون کو اباسین آرٹس کونسل کی جانب سے ۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۳ء کا فارغ بخاری ایوارڈ دیا گیا۔ گندھارا ہندکو بورڈ کی جانب سے تقریبِ رونمائی کے دوران اعزازی شیلڈ پیش کی گئی۔ اباسین آرٹس کونسل کی جانب سے ہی سلطان سکون کو طلائی تمغہ بھی پہنایا گیا۔

سوچ رت:

سوچ رت سلطان سکون کا مرتب کردہ غزلیات کا مجموعہ ہے۔ جس میں اسّی کے قریب شعراء کی ایک ایک غزل ان کے مختصر تعارف کے ساتھ شامل کی گئی ہے۔ یہ تالیف ۲۰۰۲ء میں سامنے آئی۔ یہ حاجی گل بخشالوی کے ساتھ مل کر ترتیب دی گئی اس کا زیادہ تر کام سلطان سکون نے ہی کیا ہے۔ سلطان سکون نے ''عرضداشت'' کے عنوان سے مضمون میں کتاب کے حوالے سے اپنی معروضات پیش کرنے کے

علاوہ گل بخشالوی کا تعارف بھی کرایا ہے۔

گل بخشالوی کا خاندانی نام سبحان الدین اور قلمی نام گل بخشالوی ہے۔ آپ کا بنیادی تعلق ضلع مردان سے ہے۔ جہاں سے وہ کھاریاں (پنجاب) منتقل ہوئے اور وہاں سے پہلے ''قلم قافلہ'' کے نام سے ایک ادبی ہفت روزہ اور بعد ازاں ''کھاریاں ٹائمز'' کے نام سے اخبار جاری کیا۔ بعد ازاں ۱۹۹۸ء میں وہ امریکہ ہجرت کر گئے اور تا حال وہیں مقیم ہیں۔

کتاب کا انتساب محمد امجد چوہدری (USA) کے نام ہے جن کی تصویر کتاب کے پس ورق گل بخشالوی کے ساتھ ہے۔ ۱۹۶ صفحات پر مشتمل یہ کتاب شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے اگست ۲۰۰۲ء میں طبع ہوئی۔

کتاب میں ''خوش بخت بخشالوی'' کے عنوان سے گل بخشالوی نے اپنی مختصر روداد بھی لکھی ہے۔ کتاب کو شعراء کی رنگین تصاویر سے مزین کیا گیا ہے جس میں ملک بھر سے شعراء کا کلام شامل ہے۔ شاعروں کی عمرانی ترتیب ہے یعنی سب سے پہلے بڑی عمر کے اور پھر علی الترتیب چھوٹی عمر کے شاعر شامل ہیں۔

دلسو جھے:

سلطان سکون نے اردو کے ساتھ ساتھ ہندکو زبان میں بھی بہت عمدہ شاعری کے ذریعے قارئین ادب سے بے پناہ داد حاصل کی ہے۔ ''دلسو جھے'' ان کی ہندکو شاعری کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعی طور پر سلطان سکون کی نویں کتاب ہے۔ جس میں ایک طویل حمد، تین نعتیں، دو سلام اور ۳۱ نظمیں جبکہ ۲۶ غزلیں شامل ہیں۔ ۲۳ ماہیے، دو گیت اور آٹھ قطعات بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ ایک قطعہ احمد ندیم قاسمی کے اردو قطعے کا ہندکو روپ ہے۔ سلطان سکون کی زیادہ تر نظمیں موضوعاتی ہیں جن میں حضرت قائد اعظم، پاکستان دا گیت، دو ماواں، ۲۳ مارچ، ماں، دہشتگردی، بھیم (زلزلہ)، حیاتی، جھیاں نماڑیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ''دلسو جھے'' کا انتساب اول شاعر، افسانہ نگار، صحافی انجم جاوید جبکہ دوسرا شاعر، کیلی گرافر تسنیم سید کے نام ہے۔

کتاب کے فلیپ پر فضل اکبر کمال، پروفیسر محمد فرید، واحد سراج، پروفیسر یحییٰ خالد جبکہ کتاب کے آغاز میں پروفیسر صوفی عبدالرشید اور آصف ثاقب کے مضامین شامل ہیں۔ سلطان سکون نے

''میری گل'' کے عنوان سے اپنی روداد لکھی ہے۔ ۱۶۷ صفحات پر مشتمل یہ ہندکو شعری مجموعہ ۲۰۰۸ء میں مثال پبلشرز فیصل آباد سے شائع ہوا۔

''دلسو تھے'' کو ۲۰۰۹ء میں اباسین آرٹس کونسل کی جانب سے ایوارڈ اور ۵ ہزار روپے نقد انعام کا حقدار قرار دیا گیا جبکہ ۲۰۱۰ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ایک لاکھ روپے نقد اور ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ایبٹ آباد کی ادبی وسماجی تنظیم ٹوڈ بلیوز ویلفیئر آرگنائزیشن کی جانب سے دلسو تھے کی اشاعت پر سلطان سکون کو خالص سونے کا تمغہ پہنایا گیا۔

کوزے بچ دریا:

''کوزے بچ دریا'' سلطان سکون کی دسویں کتاب ہے جو کہ ہندکو زبان کے محاورات پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے شائع ہونے والی ایک اور کتاب ''ہندکو ضرب الامثال'' میں زیادہ تعداد ضرب الامثال کی تھی جبکہ یہ محاورات پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ کتاب جون ۲۰۰۹ء میں مثال پبلشرز فیصل آباد سے شائع ہوئی۔ ۱۴۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ۵۸۲ محاورات وضرب الامثال ہیں۔ کتاب میں ۲۶ دعائیہ کلمات اور ۹ بددعائیں بھی شامل ہیں جو ہندکو زبان کے مخصوص لہجے میں ڈھل کر ضرب الامثال کی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ کتاب کی قیمت ۱۶۰ روپے ہے۔ خوبصورت سرورق محمد عابد نے بنایا ہے۔ جنھوں نے سلطان سکون کی چند دیگر کتب کے سرورق بھی بنائے ہیں۔

انتساب ہندکو اور اردو زبان کے شعروادب کی جانی پہچانی شخصیت جناب عبدالوحید بسمل کے نام ہے۔ کتاب کے ابتدائی فلیپ پر صوفی عبدالرشید جبکہ اختتامی فلیپ پر آصف ثاقب کی آراء درج ہیں۔ ''اپنی بات'' کے زیرِ عنوان سلطان سکون نے ضرب الامثال کے بارے میں رائے پیش کی ہے کہ:

> ''دراصل ضرب المثل یا محاورہ انسانی زندگی میں بار بار پیش آنے والے نوع بہ نوع حالات وواقعات اور گرم وسرد زمانہ تجربات ومشاہدات کا جوہر ہوتے ہیں جو بجائے خود حکمت ودانش سے لبریز ہوتے ہیں۔'' (۱۰)

''کوزے بچ دریا'' کو ۲۰۱۱ء میں اباسین آرٹس کونسل کی جانب سے ''فارغ بخاری ادبی ایوارڈ''

کا حق دار قرار دیا گیا۔ اس کتاب کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ صوبہ سندھ کے شہر قمبر (Kamber) کے انجینئر عبدالوہاب سہتو نے اس کو سندھی زبان میں ترجمہ کیا اور یہ کتاب جنوری ۲۰۱۸ء میں ڈاکٹر محبت اکیڈمی قمبر سے شائع ہوئی۔

کوئی ہے:

۲۰۰۱ء میں سلطان سکون کی اردو شاعری کا پہلا مجموعہ ''کوئی خواب ہے نہ خیال ہے'' شائع ہوا۔ جس نے اردو کے شعری منظرنامے پر خاصی پذیرائی حاصل کی۔

''کوئی ہے'' سلطان سکون کی اردو شاعر کا دوسرا مجموعہ ہے جو دسمبر ۲۰۱۳ء میں فیصل آباد کے مشہور اشاعتی ادارے مثال پبلشرز نے شائع کیا۔ کتاب ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کی قیمت ڈھائی سو روپے رکھی گئی ہے۔ سرورق محمد عابد نے بنایا ہے۔

کتاب کا انتساب ہزارہ کی نامور علمی و ادبی شخصیات پروفیسر آصف ثاقب، پروفیسر صوفی عبدالرشید، پروفیسر محمد ارشاد اور عبدالواحد سراج کے نام ہے۔ اس مجموعے کے آغاز میں ایک حمد، دو نعتیں، ایک سلام اور ایک دعا شامل ہیں۔ ۷۳ غزلیات جبکہ ۷ نظمیں بھی کتاب کا حصہ ہیں۔ ایک غزل احمد فراز کی زمین میں کہی گئی ہے۔ جو نذر فراز ہے۔ ایک غزل محمد رفیع سودا کی زمین میں ہے۔ جو نذر سودا ہے جبکہ ایک غزل ''نذر نظام رامپوری'' ہے۔ نظموں میں سے ایک نظم مہدی حسن جبکہ ایک احمد فراز کی یاد میں ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں احمد فراز کا ایک حوالہ جاتی شعر بھی درج ہے:

برائے نام بھی ہم کو سکون کیا ہو جہاں
سکون نام کا ایک شخص اضطراب میں ہے

کتاب کے فلیپس پر جناب احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، شبنم رومانی، محسن احسان، پروفیسر محمد ارشاد، آصف ثاقب اور پروفیسر صوفی عبدالرشید کی آراء سے اقتباسات شامل کیے گئے ہیں۔ یہ آراء انھوں نے سلطان سکون کے اولین اردو شعری مجموعے ''کوئی خواب ہے نہ خیال ہے'' میں مضامین کی صورت میں پیش کی تھیں۔

سلطان سکون نے اس شعری مجموعے میں اپنے پہلے شعری مجموعے کی چند غزلیں بھی شامل کی ہیں۔

کوئی ہنستا دکھائی دے:

یہ سلطان سکون کی اب تک شائع ہونے والی بارہویں کتاب ہے۔ یہ موضوعاتی نظموں اور قطعات کا مجموعہ ہے جو دسمبر ۲۰۱۶ء میں مثال پبلشرز فیصل آباد سے شائع ہوا۔ ۱۲۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ۳۰۰ روپے رکھی گئی ہے۔ انتساب ڈاکٹر عبدالحمید میر بٹ منگ آزاد کشمیر اور ایک باذوق اور مخلص نوجوان سعد ملک کے نام ہے۔

کتاب کا آغاز سلطان سکون کے پسندیدہ شاعر عبدالحمید عدم کے اس شعر سے ہوتا ہے:

عدم خلوص کے بندوں میں ایک خامی ہے
ستم ظریف بڑے جلد باز ہوتے ہیں

سلطان سکون نے ''عرض داشت'' کے عنوان سے تعارفی مضمون میں اس مجموعے میں شامل شاعری کی نوعیت کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''مذکورہ نظموں اور قطعات کا کوئی ایک خاص موضوع نہیں اور نہ یہ جذبات کی شاعری ہے کہ کوئی قاری پڑھ کر سر دھننے پر مجبور ہو جائے۔ مجموعی طور پر یہ طنز و مزاح کی حامل ہیں۔ جن میں کہیں کہیں براہ راست اور کہیں کہیں زیریں سطح پر طنز و مزاح کی لہریں محسوس کی جا سکتی ہیں۔(۱۱)

یہ سلطان سکون کی شگفتہ شاعری کا مجموعہ ہے جس کے ذریعے انھوں نے اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی کے روپ میں پیش کیا ہے تلخ حقائق اور روزمرہ پیش آنے والے حالات کو بڑی شگفتگی سے بیان کیا اور اپنی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ کتاب کا خوبصورت سرورق محمد عابد نے بنایا ہے۔

کتاب میں ''ہزل'' کے عنوان سے عبدالحمید عدم کی زمین میں ایک مزاحیہ غزل لکھی ہے۔ نمونے کے طور پر اس نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ شادی تری شادیانے ترے
وہ دن رات گانے بجانے ترے
چلو ناک تو تیری اونچی ہوئی
بلا سے وہ قرضے اٹھانے ترے

ہوئیں ختم شادی کی جب رونقیں
تو ہوش آئیں گے پھر ٹھکانے ترے

کچھ پھول عقیدت کے:

کچھ پھول عقیدت کے سلطان سکون کی اب تک شائع ہونے والی آخری کتاب ہے یہ آپ کی تیرھویں کتاب ہے۔ یہ بنیادی طور پر آپ کی نظموں کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں مشہور و معروف شخصیات، احباب، وطن اور کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔

جن کے موضوعات کچھ یوں ہیں۔ علامہ اقبال، قائداعظم، مادر ملت، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز، قتیل شفائی، صوفی عبدالرشید، واحد سراج، حفیظ اثر، کشمیر، دو مائیں اور دعا وطن کے لیے وغیرہ۔

اس کتاب میں ان لوگوں کی ایک فہرست بھی شامل ہے جنھوں نے مختلف حوالوں سے سلطان سکون کی شخصیت و فن پر نثری اظہار خیال کیا اور جن احباب نے انھیں منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اس کی بھی ایک جھلک کتاب میں موجود ہے۔ سلطان سکون نے اپنے علمی و ادبی سفر کے دوران ہزاروں کی تعداد میں اہل ادب کو خطوط ارسال کیے ہیں، جواب میں آپ کے نام بھی علمی و ادبی شخصیات کی طرف سے خطوط آتے رہے ہیں جن نامور اہل علم و ادب کے خطوط آپ کے نام آتے رہے ہیں ان کی فہرست بھی کتاب کے آخر میں موجود ہے۔ کہنے کو تو یہ سلطان سکون کی نظموں کا مجموعہ ہے لیکن دراصل یہ ان کے حوالے سے تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک بہت عمدہ اشاریہ بھی ہے۔

یہ کتاب بھی حسب سابق مثال پبلشرز فیصل آباد نے شائع کی ہے۔ کتاب کا انتساب انھوں نے اہل خانہ اور دونوں بڑی مرحومہ بہنوں کے نام کیا ہے۔ کتاب کی ابتداء حمد و نعت سے ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد سلطان سکون نے ''عرضداشت'' لکھی ہے جس میں کتاب کے حوالے سے تفصیل درج ہے۔ اپنے اہل خانہ کے حوالے سے وہ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''میں اپنے جملہ اہل خانہ کے سامنے اپنے اس غیر مناسب رویے پر شرمسار ہوں کہ مجھے جو وقت ان کو دینا چاہیے تھا وہ اپنے ادبی مشاغل میں صرف کرتا رہا اور مجھے ادب میں جو بھی جیسا بھی نام و مقام ملا ہے اس میں بالواسطہ اور بلا واسطہ میرے اہل خانہ کا ہاتھ رہا ہے یہ سہرا ان کے سر بندھتا ہے۔'' (۱۲)

کتاب کی نظمیں سلطان سکون کے دلی جذبات کی ترجمان ہیں۔ انھوں نے اپنے اسلاف کے لیے عقیدت کے پھول نچھاور کیے ہیں تو احباب کے لیے محبت میں گندھے الفاظ کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ کتاب محض ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے اور سن اشاعت ۲۰۱۸ء ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

۱۔ سلطان سکون، بجھ میری بجھارت، جمہور پرنٹنگ پریس، ایبٹ آباد، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۷

۲۔ سلطان سکون، چنو چودھویں رات، ایجوکیشنل پریس، کراچی، اگست ۱۹۹۶ء، ص ۶۸

۳۔ ایضاً، ص ۷۰

۴۔ ایضاً، ص ۷۱

۵۔ سلطان سکون، کاری دی گل، شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور، دسمبر ۱۹۹۳ء، ص ۸

۶۔ صوفی عبدالرشید، "تحریر دار" مشمولہ ہندکو ضرب الامثال از سلطان سکون، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۳

۷۔ ڈاکٹر نذیر تبسم، سرحد کے غزل گو شعراء، بخاری پبلشرز، پشاور، ۲۰۱۶ء، ص ۱۴۷۔۱۵۷

۸۔ سلطان سکون، ستارا لوئی دا، ۱۰۰۱ کہیال، ایبٹ آباد، دسمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۵

۹۔ صوفی عبدالرشید، "حرفِ مختصر (دیباچہ)"، ہندکو اردو لغت، گندھارا ہندکو بورڈ، پشاور، ۲۰۰۲ء، ص viii

۱۰۔ سلطان سکون، کوزے وچ دریا، مثال پبلشرز، فیصل آباد، جون ۲۰۰۹ء، ص ۷

۱۱۔ سلطان سکون، کوئی جستا دکھائی دے، مثال پبلشرز، فیصل آباد، دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۔۱۴

۱۲۔ سلطان سکون، کچھ پھول عقیدت کے، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۱۸

باب: سوم

سلطان سکون کی اُردو شاعری

الف: غزل

غزل کی مختصر روایت:

غزل اردو شاعری کی محبوب ترین صنفِ سخن ہے گو کہ اس کا آغاز عربی سے ہوا اور روایات کے مطابق عربی قصیدے کی تشبیب نے غزل کا روپ دھارا لیکن اردو میں اس کا ورود فارسی کے ذریعے سے ہوا۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس نے تمام اصنافِ سخن پر فوقیت حاصل کر لی۔ غزل کی مقبولیت میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوا اور آج غزل ہی اردو شاعری کی سب سے نمائندہ صنف ہے بلاشبہ یہ اردو شاعری کی آبرو ہے۔ غزل کی ابتدا کے حوالے سے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ''غزل عربی لفظ ہے جس کے معنی محبوب کی باتیں کرنے کے ہیں اور غزلیت یا تغزل یعنی ایک خاص انداز کا باوقار اور سنجیدہ گداز جو عشق کی پہچان ہے اہلِ عرب کے نزدیک بھی اچھی شاعری کی ممتاز علامت ہے۔ لیکن شاعری کی ایک مخصوص صنف کی حیثیت سے غزل عرب کی پیداوار نہیں۔ یہ جنسِ گراں ایران میں پیدا ہوئی وہیں اس کا بازار گرم ہوا اور وہیں سے ہندوستان آ کر اردو میں رواج پایا۔'' (۱)

غزل جب فارسی سے اردو میں آئی تو یہ اپنے ساتھ وہاں کی پوری تہذیب لائی۔ وہی اسلوب بیاں تشبیہات واستعارات، محاورات اور بنیادی لوازمات، اردو غزل اسی کے زیر اثر پروان چڑھنا شروع ہوئی اور دو سو سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باجود آج بھی وہ اثرات موجود ہیں۔ ہندوستان میں اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی اور بہت عرصہ تک ولی اردو شاعری کا باوا آدم سمجھا جا تا رہا تا ہم

بعد میں جب قلی قطب شاہ کا دیوان سامنے آیا تو انھیں اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔
البتہ ولی دکنی کی اہمیت اس حوالے سے آج بھی مسلم ہے کہ انھوں نے اردو غزل کو ہندوستان کی تہذیب
اور یہاں کی فضا سے روشناس کرانے اور کسی حد تک فارسی اثر کم کرنے میں ولی نے بنیادی کردار ادا
کیا۔ولی دکنی نے اردو غزل کی روایت قائم کی۔ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے محمد خان
اشرف رقمطراز ہیں:

> ''ولی اُردو غزل گو شعرا میں ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے ولی اردو کا وہ پہلا
> شاعر ہے جس نے غزل کے جملہ امکانات کا جائزہ لیا اور انھیں اپنی شاعری
> میں برتا،اس نے غزل کو موضوع ،زبان و بیان اور ہیئت کے لحاظ سے ایک
> مکمل روایت بخشی۔''(۲)

بلاشبہ ولی کی خدمات اس حوالے سے اولین حیثیت کی حامل ہیں۔ولی نے جب دلی کا سفر کیا
تو وہاں کی شعری فضا سے استفادہ کیا۔اہل دلی نے بھی ولی کے کچھ اثرات قبول کیے۔دلی نے اردو
غزل کو میر جیسا صاحب کمال عطا کیا۔میر نے اردو غزل کو رفعت اور ترقی کی راہ پر ڈال دیا اور وقت
گزرنے کے ساتھ ساتھ غزل نے باقی تمام اصناف کے مقابلے میں اعتبار حاصل کر لیا۔دوسری
طرف لکھنو کے منظرنامے پر آتش غزل کی زلف سنوار رہے تھے۔تاہم میر کی شاعری غزل کی روح
کے عین مطابق تھی کہ غزل اپنے وسیع تر مفہوم میں جس سوز و گداز،غم انگیزی اور عشق و محبت کی حامل
ہے میر کی غزل میں وہ سارے رنگ بدرجۂ اتم موجود ہیں۔اس لیے میر کو اردو غزل کا سب سے بڑا
شاعر قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دوسو سال گزرنے کے باوجود اس کی غزل آج بھی اپنے اندر
جاذبیت رکھتی ہے۔

میر نے غزل کو جس سوز و گداز سے روشناس کرایا وہ کوئی عام نوعیت کا نہیں تھا بلکہ انھوں نے
اس کو غزل میں اس انداز سے سمویا کہ غم کے اندر ایک نشاط کی کیفیت پیدا کر دی۔ بلکہ بقول ڈاکٹر
جمیل جالبی:

> ''میر تو اپنے غم کے اظہار سے اپنے قاری کو پستی کے عالم سے اٹھا کر بلندی کی
> طرف لے جاتے ہیں میر ہمیں رلاتے نہیں ہیں بلکہ غم کو اس طرح بیان کرتے
> ہیں کہ ہم غم کے حسن اور حسنِ بیان سے خود غم کو اس طرح بھول جاتے ہیں جیسے

کسی بدنما چیز کی خوبصورت تصویر دیکھ کر اس کی بدنمائی کو بھول جاتے
ہیں۔"(۳)

میر کی غزل اردو شاعری میں اس قدر انفرادیت کی حامل ہے کہ اس کی تر و تازگی آج بھی برقرار ہے اور یہی وجہ ہے کہ میر نے اردو میں "خدائے سخن" کا درجہ حاصل کر لیا اور ذوق جیسے شاعر نے انھیں یوں خراج تحسین پیش کیا:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ذوقؔ کے ہم عصر غالب نے بھی اردو غزل کو جدت سے ہمکنار کیا غالب ایک انقلابی ذہن کے شاعر تھے اور اپنی افتادِ طبع کی بدولت اردو غزل کو نئے ذائقے سے روشناس کرایا۔ نہ صرف پیرایہ اظہار میں رنگارنگی پیدا کی بلکہ فلسفیانہ مضامین کو بھی اس انداز سے غزل کا حصہ بنایا کہ معنی آفرینی کے نئے در کھلتے گئے۔

غالب نے صحیح معنوں میں غزل کو نئی لفظیات اور نئے تجربات سے بہرہ مند کیا۔ ان کی غزل روایت اور جدت کے امتزاج سے نئی معنویت کی حامل ٹھہری۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے غالب کی غزل کے اسی پہلو کو اجاگر کیا ہے:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ غالب نے روایت سے استفادہ کیا ہے اور اس کے اثر سے اپنے فن میں نہ صرف رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات پیدا کی ہیں بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اس میں نمایاں ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف غالب کے فن میں بلکہ خود غزل کے فن میں ایک نئے رنگ و آہنگ نے اپنی جگہ بنائی ہے۔"(۴)

اردو غزل کے حوالے سے غالب ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے روایت کے ساتھ جدت کو ہم آہنگ کر کے اس کی تہذیب نو کا فریضہ انجام دیا اور بلاشبہ یہاں سے اردو غزل ایک نئے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ غالب کے معاصرین میں مومن، بہادر شاہ ظفر اور ذوق جیسے اساتذہ فن تھے۔ جنھوں نے اپنا اپنا حصہ شامل کر کے غزل کے رنگ و روپ کو نکھارا۔ تاہم حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" میں غزل کی جس تنگ دامانی کا شکوہ کیا اور اس کو "دوراز کار صنف" قرار دیتے ہوئے اس کو وسعت دینے کا

مطالبہ کیا لہٰذا یہ فریضہ بیسویں صدی کے آغاز میں ہی علامہ اقبال نے سرانجام دیا۔ اقبال کی شاعری بحیثیت مجموعی آفاقیت کی حامل ہے ان کے ہاں لفظ و معنی اور فکر و فلسفہ کا ایک الگ جہاں دکھائی دیتا ہے۔ ابتدا میں علامہ اقبال نے داغ جیسے منفرد غزل گو سے استفادہ کیا لیکن بعدازاں انھوں نے غزل کو روایت کے ساتھ ساتھ جدت سے ہمکنار کیا۔ اقبال نے جس طرح نظم کے ذریعے اردو شاعری کو سربلند کیا اسی طرح غزل کو بھی نئے مفاہیم سے آشنا کیا۔ غزل میں نئے الفاظ و تراکیب اور نئی نئی اصطلاحات کو متعارف کرایا۔ اقبال کی غزل کے حوالے سے نجیب جمال یوں رقمطراز ہیں:

> ''اقبال نے نہ صرف اردو غزل کے کلاسیکی سرمائے سے استفادہ کیا بلکہ ان کے مزاج کی انفرادیت نے نئی نئی اصطلاحات، نئے نئے رموز و علائم کا ایک ذخیرہ بھی مہیا کیا۔ وہ علامات و استعارات جو روایتی انداز میں استعمال ہونے سے اپنی توانائی کھو چکے تھے اقبال نے انھیں نئے مفاہیم سے آشنا کیا۔''(۵)

گویا اقبال نے حالی کے اعتراضات کا صحیح معنوں میں ازالہ کیا غزل کے نہ صرف موضوعات کو وسعت دی بلکہ اس میں فلسفہ و تمدن انسانی کو بروئے کار لائے بلکہ جس طرح ان کی نظم میں تنوع تھا اسی طرح انھوں نے غزل کو بھی نئے موضوعات و اسلوب سے مزین کیا۔ علامہ اقبال کی غزل میں نئے نئے مضامین کی بہار دکھائی دیتی ہے۔ جو اردو غزل کے فکری و فنی سرمائے میں بے پناہ اضافے کا باعث ہے اور بعد میں آنے والے شعراء نے اس سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

جدید اردو غزل کے گیسو سنوارنے والوں میں دو بڑے نام حسرت موہانی و جگر مرادآبادی کے ہیں اور ان کے بعد ناصر کاظمی اور ان کے چند معاصرین نے غزل کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان کے بعد اردو غزل کا جدید تر دور ہے۔ اس دور میں شکیب جلالی، عبدالحمید عدم، احمد مشتاق، احمد فراز، قتیل شفائی، باقی صدیقی، پروین شاکر، ظفر اقبال، ادا جعفری اور سلیم کوثر کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

سلطان سکون کی غزل:

سطور بالا میں جس غزل کی مقبولیت اور اس کی روایت کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہی غزل سلطان سکون کی بھی محبوب صنفِ سخن ہے اور وہ بھی اس کی روایت اور اس کے تسلسل کا حصہ ہیں کیوں کہ کم و بیش چھ دہائیوں سے اس کی زلف سنوارنے میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ سلطان سکون نے شاعری کی ابتداء

پچاس کی دہائی کے آخر میں کی۔ ان کا تعلق قیامِ پاکستان کے بعد پروان چڑھنے والی نسل سے ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کے اہم شعراء کی موجودگی میں اپنا شعری سفر شروع کیا۔ ابتداء میں ان کی شاعری مقامی اخبارات و رسائل تک محدود رہی بعد ازاں انھوں نے مشاعروں میں اپنا کلام سنانا شروع کیا تو پھر پلٹ کر نہیں دیکھا اور ان مشاعروں کا لازمی حصہ بن گئے۔ انھوں نے یوں تو سب ہی اصناف میں داد سخن دی ہے لیکن غزل ان کی خاص پہچان ہے۔ انھوں نے خود اپنے ایک انٹرویو میں غزل کو اپنی پسندیدہ ترین صنفِ سخن قرار دیا۔

''یوں تو میں نے غزل، پابند نظم اور قطعات وغیرہ بھی لکھے ہیں لیکن میری پسندیدہ ترین صنفِ سخن غزل ہے۔''(۶)

سلطان سکون نے جس وقت اپنا شعری سفر شروع کیا تو ہزارہ میں اہلِ ادب کی ایک کہکشاں موجود تھی اور ملک بھر کے نامی گرامی شعرا کی یہاں آمد کا سلسلہ جاری تھا علاقائی اور ملکی سطح کے کئی مشاعروں کی وجہ سے یہاں کی فضا شاعری کے لیے نہایت موزوں تھی کیوں کہ ان مشاعروں میں جگر مرادآبادی، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، احمد فراز، قتیل شفائی اور فارغ بخاری، احمد ندیم قاسمی اور حبیب جالب جیسی شخصیات شرکت کر چکی تھیں اور اس دوران سلطان سکون بھی کافی مشاعروں میں شریک ہو چکے تھے۔ بلکہ اس وقت تک وہ ان مشاعروں کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔

سلطان سکون نے اپنی انتھک محنت اور مسلسل ریاضت سے اردو شاعری خصوصاً غزل میں خوب نام کمایا اور مشاہیر و معاصرین سے خوب خراجِ تحسین حاصل کیا۔ سلطان سکون انتہائی سادہ طبیعت اور منکسر المزاج شخصیت کے مالک ہیں اور یہی سادگی اور سلاست ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ انھوں نے عمر بھر شعر و ادب کی خدمت کی اور بغیر کسی سے اصلاح لیے محض اپنی ذاتی کاوش سے اردو غزل میں خوبصورت اضافے کیے۔ تاہم وہ جب اپنے پروردگار کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں تو یوں گویا ہوتے ہیں:

یارب طلب نہیں ہے کہ مال و منال دے
شاعر ہوں مجھ کو شعر و سخن میں کمال دے
اس کے سوا نہیں ہے طلب کچھ سکونؔ کی
اک آگہی جو قلب و نظر کو اجال دے

گویا انھوں نے اپنے پروردگار سے بھی کوئی مادی شے، کوئی دھن دولت طلب نہیں کی بلکہ اپنے لیے شعر وسخن میں کمال اور آگہی کا سوال کیا ہے۔ لیکن انھوں نے جو آگہی طلب کی تھی پھر عمر بھر اس کا درد بھی سہنا پڑا کہ فقیر منش سلطان سکون کے لیے معاشرتی اونچ نیچ، جبر واستحصال ہمیشہ بے سکونی کا باعث رہے ہیں۔ اوران کی اس بے سکونی پر احمد فراز جیسے شاعر کو کہنا پڑا۔

برائے نام بھی ہم کو سکون کیا ہو جہاں
سکون نام کا اک شخص اضطراب میں ہے

لیکن سلطان سکون کا یہ دکھ یہ کرب ذاتی نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسانی قدروں کی پامالی کا دکھ ہے۔ یہ روایت شکنی کا دکھ ہے کیوں کہ ان کی شاعری کا سب سے بڑا موضوع "انسانیت" ہے۔ لہٰذا وہ انسانیت کے دکھ میں مبتلا ہیں۔

سلطان سکون نے بذاتِ خود بڑی عسرت میں زندگی بسر کی ہے لیکن ان کی شاعری میں اس ذاتی دکھ کی بجائے مجموعی معاشرتی دکھ کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

فقط اپنے حال پہ دلگرفتہ تو ہم نہیں
یہ جو خلقِ شہر نڈھال ہے یہ ملال ہے

نہیں کہ رہتے ہیں اپنے ہی دکھ پہ افسردہ
ہمیں تو اوروں کے دکھ بھی نڈھال رکھتے ہیں
کوئی سنائے تو سنتا ہوں درد مندی سے
کہ دکھ کسی کا ہو لگتا ہے ہو بہو میرا

میں جو اٹھتے بیٹھتے آنکھ بھگو لیتا ہوں
اوروں کے دکھ درد بھی دل میں چبھو لیتا ہوں
میرے دکھ کی شدت کچھ کم پڑ جاتی ہے
جب ان میں اوروں کے دکھ بھی سمو لیتا ہوں

یہ جو دوسروں کے دُکھ کو اپنا دُکھ سمجھتا ہے یہ ان کی تربیت کا حصہ ہے یہ اس ماحول کی عطا ہے جس

میں ان کی تربیت ہوئی۔

سبھی کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا
ہمیں حاصل یہی تربیتیں ہیں

میری خوشی تو یہ ہے کہ میری بھی کچھ خوشی
اک غم نصیب شخص کے دامن میں ڈال دے

سلطان سکون کی غزل میں ایسے بے شمار اشعار ملتے ہیں جن میں مجموعی معاشرتی کرب کی گونج سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی یہ اسی کا اعجاز ہے کہ وہ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک دوسروں کے لیے زندہ رہنا ہی زندگی کی معراج ہے۔ خوشحال، مستحکم اور پرامن معاشرے کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ایک دوسرے کے حق کو تسلیم کیا جائے جس کا اظہار سلطان سکون کے ہاں کچھ اس طرح ہوتا ہے:

تری حیات پر حق دوسروں کا بھی ہے سکون
مفادِ ذات میں اپنے بسر نہ ہو جانا

خداوندا مسیحا بھیج کوئی
تری مخلوق دکھیاری بہت ہے

سلطان سکون کے ہاں یہ مخلوق کا دکھ ذاتی دکھ پر ہمیشہ غالب رہتا ہے وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی بہت زود رنج ہیں اور انھیں چھوٹی چھوٹی معاشرتی کج رویوں سے بھی اذیت پہنچتی ہے۔ ان کی غزل میں ان کی ذاتی زندگی کا عکس بہت واضح ہے۔ وہ اپنے اردگرد سے لاتعلق نہیں رہ سکتے اور اپنے اردگرد کے مسائل کو اپنے اشعار میں پرو کر اردو غزل کو مالا مال کر رہے ہیں۔ پروفیسر صادق زاہد نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:

"سلطان سکون اپنی شاعری میں صرف خلاؤں سے مخاطب نہیں ہوتا بلکہ اس دنیا میں رہتے ہوئے جب اپنے اردگرد انسانی اقدار کو پامال ہوتے دیکھتا ہے تو خاموش نہیں رہ سکتا۔" (۷)

سلطان سکون کا تعلق اس نسل سے ہے جنھوں نے ہمیشہ اقدار کی پاسداری کی ہے۔ ان کے نزدیک مادی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس لیے وہ سماج میں روز بروز بڑھتی ہوئی مادیت پرستی پر نوحہ کناں ہیں اور اپنے اردگرد جب معاشرتی قدروں کی پامالی، مال وزر کی شدید خواہش اور ہوس دیکھتے ہیں تو خاموش نہیں رہتے بلکہ بھرپور اظہار کرتے ہیں:

کہاں وہ لوگ جو درد بانٹتے تھے سکونؔ
کہ اب تو حال بھی رسماً ہی پوچھتا کوئی ہے

اس دور کا عمومی وتیرہ ہے یہ سکونؔ
ایمان بک بھی جائے تو پیسہ بنایئے

اور غزل کے یہ اشعار اس پر بھرپور ردعمل کے مظہر ہیں:

درخت کٹتے گئے اور مکان بنتے گئے
ہمارے سر پہ کئی آسمان بنتے گئے
ضمیر سوتے گئے ظرف تنگ ہوتے گئے
مگر مکان بہت عالیشان بنتے گئے
وہ لمحے خواب ہوئے وہ تخن سراب ہوئے
نگاہیں برف ہوئیں دل چٹان بنتے گئے
اسی حساب سے بڑھتی گئی ہے سنگدلی
جس اہتمام سے پختہ مکان بنتے گئے

یہاں قدر داں نہیں کوئی خلق و خلوص کا
یہاں حرمتِ زر و مال ہے یہ ملال ہے
یہاں مست ہیں سبھی اپنے عیش و نشاط میں
کسے غم زدوں کا خیال ہے یہ ملال ہے

ترقی کے نام پر انسان نے اپنے آپ کو مشینی بنا لیا ہے کچے مکانوں کی جگہ محلات نے لے لی

ہے۔ پختہ مکان کیا بنے کہ انسان بھی پتھر دل ہو گئے جذبات و احساسات کی قدر و قیمت ختم ہو گئی۔ علامہ اقبال نے بھی اس کا اظہار کیا ہے:

احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت

یہ فقط ہمارا ہی مسئلہ نہیں ہے بلکہ پوری دنیا اس سے دو چار ہے اور دنیا بھر میں اس پر مکالمہ ہو رہا ہے۔ کہیں اس کا علاج صوفی ازم میں تلاش کیا جارہا ہے تو کہیں بدھا ازم میں۔

سلطان سکون نے بھی اپنی غزلوں میں اسی کرب کا اظہار کیا ہے اور بڑے خلوص اور سچائی سے اس طرف توجہ دلائی ہے۔ سلطان سکون کا کمال یہی ہے کہ وہ انتہائی سادہ اور پُر خلوص انداز میں جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور اس بات کا اعتراف احمد ندیم قاسمی جیسی قد آور ادبی شخصیات نے بھی کیا ہے:

"سلطان سکون ایک ایسا شاعر ہے جو اپنے شعروں میں پورے اعتماد کے ساتھ سچ بولتا ہے۔ مبالغہ آرائی اسے چھو کر بھی نہیں گئی وہ لفظوں کے طوطے مینا بھی نہیں بناتا اتنے رسیلے اور سیدھے سادے انداز میں جذبے کا اظہار کرتا ہے کہ فنِ شعر کا سر بلند ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔" (۸)

سلطان سکون نے یہ مقام بڑی ریاضت کے بعد حاصل کیا ہے۔ انھوں نے اردو غزل کی کلاسیکی روایت کا بھی مطالعہ کیا ہے اور جدید شعرا کو بھی بغور پڑھا ہے لہٰذا ان کے ہاں یہ دونوں رنگ بڑی خوبصورتی سے ہم آمیز ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں انھوں نے کلاسیکی غزل سے استفادہ کیا ہے۔ اس کا رنگ یوں نظر آتا ہے۔

مرزا رفیع سودا کی زمین میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جو مجھ پہ گزری ہے جانے بھی دو ہوا سو ہوا
کہ سن کے رنج تمھیں بھی نہ ہو ہوا سو ہوا
کرو نہ پرسشِ غم کر کے میرا غم تازہ
مرے عزیزو مرے دوستو ہوا سو ہوا

اب مجھ سے وفا کیش کو ٹھکراتے پھرو ہو
دیکھو نہ کہیں بعد میں پچھتاتے پھرو ہو
کچھ دن میں اتر جائے گی یہ سرخیِ عارض
اس عارضی دولت پہ نہ اتراتے پھرو ہو

کیجیے سوچ کے اب ترکِ مراسم کہ نہ پھر
طبعِ نازک پہ گراں بارِ ندامت گزرے
زندگی بھی تو گزاری ہے قیامت کی طرح
کیا قیامت ہے اگر اس پہ قیامت گزرے

یہاں سلطان سکون نے قدیم و جدید رنگ کو بڑی مہارت سے یکجا کیا ہے اور اس سے ایک خوبصورت شعری فضا پیدا ہو گئی ہے۔

یہ ان کی فنی ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھوں نے بڑے سادہ انداز میں اپنے مخصوص ڈکشن کو استعمال کرتے ہوئے کلاسیکی غزل کو جدت سے ہمکنار کیا ہے۔ ان کی اس خوبی کو شبنم رومانی نے یوں اجاگر کیا ہے۔

''سلطان سکون اب ایک خود اعتماد حرف نگار کے طور پر تخلیقی دنیا کے سامنے آیا ہے اس کی شاعری کے ڈانڈے ماضی اور مستقبل سے دونوں جہتوں سے ملتے ہیں ماضی کی کلاسیکی دردمندی سے اور مستقبل کی اجتہادی آرزومندی سے۔''(۹)

سلطان سکون کی غزل کے موضوعات بڑے متنوع اور بھرپور ہیں۔ حسن و عشق کا موضوع غزل کا محبوب موضوع ہے اور کوئی شاعر اس سے بچ نہیں سکا۔ سلطان سکون کے ہاں بھی محبت کی ایک انوکھی فضا محسوس ہوتی ہے۔ ایک طرف انھوں نے اظہار کا وہی قرینہ اپنایا ہے جو غزل کی دو سو سالہ روایت میں سفر کر رہا ہے۔ تو دوسری طرف جدید تر لہجے میں معاملاتِ محبت کو بیان کیا ہے:

تیرے لبوں سی نزاکت ہے پنکھڑی میں کہاں
تیرے لبوں کو کبھی پنکھڑی کو دیکھتے ہیں

وہ لوگ دیکھ تو لیں ایک بار اس کو بھی
جو طنز سے میری دیوانگی کو دیکھتے ہیں
اگرچہ بزم میں بیٹھے ہیں خوش جمال کئی
سب اہل بزم مگر اک اُسی کو دیکھتے ہیں

محبوب کے سراپے کو اس خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ قاری کے دل سے بے ساختہ واہ نکلتی ہے:

وہ جھیل آنکھیں گلاب عارض سحاب زلفیں وہ شبنمی لب
خدا نے اس پیکرِ غزل میں کیے ہیں موزوں یہ
استعارے

سراپا نگاری میں سلطان سکون نے بڑی مہارت کا التزام رکھا ہے۔ ایسی خوبصورت تشبیہات اور استعارے استعمال کیے ہیں کہ غزل میں لطافت پیدا ہوگئی ہے:

وہ تیری زلف کی بیلیں وہ عارضوں کے گلاب
کھلا گئے ہیں میرے دل میں چاہتوں کے گلاب
بہار ہو کہ خزاں اپنے صحنِ دل میں سکون
سدا مہکتے رہیں گے محبتوں کے گلاب

سلطان سکون کے سادہ مگر پراثر اندازِ بیاں نے رومانویت کی فضا پیدا کردی ہے۔ وہی رومانیت جو ہمیں اختر شیرانی کے ہاں نظر آتی ہے محبت میں وارفتگی اور تعلق کا بیان کس سادگی سے وارد ہوا ہے۔ اس کی مثال بھی دیکھ لیجیے:

میں کھل اٹھا سکون اس نے جو رسماً مجھ سے پوچھا
یہ تم نے حال کیا اپنا بنا رکھا ہوا ہے

سکون اس کا وہ رسماً ہی مسکرا دینا
غمِ حیات کی ساری تھکن اتار گیا

سکون اپنا جنوں بھی ہے زیادہ
وہ صورت بھی مگر پیاری بہت تھی

اسی لیے نہ کوئی اور اتر سکا دل میں
کہ ہم نظر میں تیرے خدوخال رکھتے ہیں

سلطان سکون کی شاعری میں رومانیت کی فضا نہایت سادہ اور پرخلوص لفظوں میں سامنے آتی ہے:

کسی سے سن کے یہ میں کتنا خوش ہوا ہوا تھا
کل ان کی بزم میں میرا بھی تذکرہ ہوا تھا

سلطان سکون کی محبت میں ایک والہانہ پن ضرور ہے لیکن ساتھ ہی وہ اعتدال کی حد سے باہر نہیں جاتے اور اپنی وارداتِ محبت کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

بکھرا کے بال چاک لبادہ نہیں کیا
ہم نے کیا ہے عشق تماشا نہیں کیا

ان کی طبیعت میں حساسیت بہت زیادہ ہے اور جو شخص محبت کے معاملے میں مخلص ہو اس کو چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ناگوار گزرتی ہیں اور وہ رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ سلطان سکون نے اس کیفیت کا یوں اظہار کیا ہے کہ:

کچھ اس لیے بھی تو دل زود رنج ہے اپنا
کہ جس سے پیار کیا ہم نے والہانہ کیا

اور وہ محبت میں اقرار کی لذت ہے اور ایک دوسرے کے سامنے محبت کا اظہار ہے اس کا قرینہ بھی ملاحظہ ہو کہ جہاں تھوڑا سا شکوہ گلہ بھی ہو:

خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کے یہ کہہ دے
کہ ہم نے تجھ سے محبت میں انتہا نہیں کی

اور جدائی میں جو کیفیات گزرتی ہیں ہجر کے جو صدمات ہیں وہ بھی اردو غزل میں متنوع انداز میں وارد ہوئے ہیں۔ سلطان سکون کے ہاں انداز روایتی ہے مگر اس میں ایک طرح کی جاذبیت ہے کہ

قاری کو ان کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ عام اور سادہ لفظوں میں بڑے سلیقے سے اس کا اظہار کرتے ہیں:

چمن اداس ہے گل سرنگوں صبا ساکن
تمھارے ساتھ وہ ہنگامۂ بہار گیا

ان سے بچھڑے ہیں تو قابو میں ہمارے آخر
دلِ ناکام بڑی دیر کے بعد آیا ہے

بظاہر تو اسے ہم نے بھلا رکھا ہوا ہے
مگر دل نے اسی سے رابطہ رکھا ہوا ہے

اردو غزل کے موضوعات میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو تنوع پیدا ہوا ہے۔ عشق و محبت کے ساتھ ساتھ فلسفہ، سیاسی و سماجی موضوعات اب غزل کا مستقل حصہ ہیں۔ شاعر و ادیب معاشرے کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں اور عصری سیاسی و سماجی مسائل سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ گزشتہ کئی دہائیوں سے پوری امتِ مسلمہ جس بے بسی کا شکار ہے اور ترقی کی دوڑ میں باقی دنیا سے پیچھے ہے۔ اس کا دکھ ہر ذی شعور فرد کو ہے۔ اس کو سلطان سکون نے بڑی دردمندی سے اپنی غزل کا موضوع بنایا ہے:

عجب سفر ہے جو طے کر رہے ہیں برسوں سے
نہ کوئی سمت نہ منزل نہ انتہا کوئی ہے

مرا نگر کسی آسیب کی لپیٹ میں ہے
اب اس کا سایہ کسی دیدہ ور سے اترے گا
ہمارے ضبط کی میعاد ختم کب ہو گی
ہمارے صبر کا پھل کب شجر سے اترے گا
نہ جانے ختم ہو کب بے جہت سفر اپنا
نہ جانے بوجھ یہ کب اپنے سر سے اترے گا

ہم نے بحیثیت قوم اور بحیثیت امت اپنی منزل کا تعین ہی نہیں کیا اور نہ کوئی ایسا راہنما میسر آیا ہے جو درست سمت میں راہنمائی کرتا لہٰذا ہمارا سفر ہی رائیگاں جا رہا ہے۔ جس کا احساس سلطان سکون کے ہاں شدت کے ساتھ ان کے اشعار میں سامنے آیا ہے۔ اس کے بیان سے ایک طرف وہ اپنا تزکیہ کرتے ہیں تو دوسری طرف، یہ ان کے عصری شعور اور آگہی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔

ہماری سماجی قدریں ہمارے معاشرے کی پہچان ہیں جن میں رشتوں کے احترام کو خاص اہمیت ہے۔ بالخصوص والدین اولاد کے لیے وجہ آسودگی ہوتے ہیں اور ماں کی محبت کو تو دنیا بھر کے ادب میں بڑے اہتمام سے پیش کیا گیا ہے۔ شاعری میں بھی اور نثری ادب میں بھی اس کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ میکسم گورکی جیسے بڑے ناول نگار کا ناول "ماں" ہو، قدرت اللہ شہاب کا "ماں جی" ہو یا حامد سراج کا "میا"۔ یہ ماں سے محبت کے بہترین اظہاریے ہیں۔ سلطان سکون نے بھی اس موضوع پر بڑے پراثر اشعار سے اپنی غزلوں کو سجایا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں:

اک میں اللہ دوجے میں ماں ہوتی ہے
دل کے تو یہ دو ہی خانے ہوتے ہیں

جو ماں نہیں ہے تو گھر کے ہر ایک کمرے میں
نہ ڈھونڈتا ہے مجھے اب نہ دیکھتا کوئی ہے

ماں جو نہیں تو اپنے دکھوں پر اب اکثر میں
اپنے ہی زانو پہ سر رکھ کر رو لیتا ہوں

اور ماں کی موجودگی اور دعاؤں کے حصار کو بہت خوبصورتی سے اردو شاعری میں برتا گیا ہے۔ سلطان سکون کا شعر ہے:

یہ زندگی جو توازن سے ہو رہی ہے بسر
مری دعا کے لیے ہاتھ اٹھا ہوا کوئی ہے

ہمارے معاشرے میں کچھ عرصے سے ایک ایسے تسلسل سے رونما ہو رہا ہے کہ بیٹا جب دیارِ غیر میں جا کر وہاں کی چکا چوند میں کھو جاتا ہے تو ماں کی آنکھیں اس کی صورت دیکھنے کو ترستی ہیں اس کرب

کو سلطان سکون نے دو مصرعوں میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے:

دیارِ غیر میں بیٹا پہنچ گیا ہے مگر
سدا ترستی ہی صورت کو ماں نہ رہ جائے

جدید اردو شاعری میں ان موضوعات کو بڑے سلیقے اور بڑی دردمندی سے بیان کیا گیا ہے۔
اسلم کولسری کا یہ شعر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے کہ:

شہر میں جا کر پڑھنے والے بھول گئے
کس کی ماں نے کتنا زیور بیچا تھا

اور ماں کی محبت کے حوالے سے عباس تابش کے اس شعر کی آج تک کوئی مثال پیش نہیں کر سکا:

ایک مدت سے میری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے ایک بار کہا تھا مجھے ڈر لگتا ہے

ان اشعار سے شاعر کی حساسیت کا پتہ چلتا ہے کہ ماں جیسی ہستی کو کس خوبصورتی سے اردو شاعری میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

اب ہمارے معاشرے کی قدریں بدل گئی ہیں۔ اب رشتوں کے تقدس کی کیفیت بھی وہ نہیں رہی ہے۔ جس سے ہمارے معاشرے کا حسن قائم تھا۔ اب شہری زندگی کی گہما گہمی اور صنعتی ترقی نے انسانوں کو مشینی بنا دیا ہے۔ اسی لیے سلطان سکون کو شہر کی نسبت دیہات کی زندگی زیادہ عزیز ہے اب بھی اپنے بچپن کی یادوں کو تر و تازہ رکھنا چاہتے ہیں اور گاؤں کے ماحول کو یاد کرتے ہیں:

ابھی گاؤں میں ہے صبر و قناعت
وہاں راتوں کو چرخہ بولتا ہے

گیا تو ساتھ میرے رو پڑے در و دیوار
میں کھیل کود کے جس گاؤں میں بڑا ہوا تھا

گاؤں کی زندگی اقدار و روایات اور رواداری کے حوالے سے سلطان سکون کی غزل کے یہ اشعار ہمیں ماضی میں جھانکنے پر مجبور کرتے ہیں:

جدا جدا تھے کبھی گھر سے گھر نگر میں مرے
بہم تھا ربط دلوں میں مگر نگر میں مرے
ہر ایک گھر سے صدا آتی تھی تلاوت کی
طلوع ہوتی تھی یوں ہر سحر نگر میں مرے
کوئی بھی آنکھ بچا کر نہ یوں گزرتا تھا
یہ وقت ایسا نہ تھا تیز تر نگر میں مرے
کسی پہ جب کوئی افتاد آن پڑتی تھی
تو جوڑ لیتے تھے سب اپنے سر نگر میں مرے
کسی کی آنکھ میں آنسو اگر اُمڈ آئے
تو ساتھ ہوتی تھی ہر آنکھ تر نگر میں مرے

دس اشعار کی اس غزل میں مسلسل اس کرب کا اظہار کیا گیا ہے اور اس دکھ کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ سلطان سکون کی غزلوں میں ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں یہ نوحہ بیان کیا گیا ہے۔

سلطان سکون نے ساری زندگی اپنے آپ کو ان مادی آلائشوں سے بچائے رکھا جو انسانی جذبات کو کچل کر اس کو مادہ پرستی کی دنیا میں دھکیل دیں۔

سلطان سکون کے مشام جاں میں کچی مٹی کی خوشبو ایسی رچ بس گئی ہے کہ انھوں نے شہر میں بھی اپنے لیے کچا مکان بنائے رکھا اور اپنی اس "قدامت پسندی" کو فخریہ طور پر پیش کیا:

یہ میری طبع قدامت پسند ہے اتنی
کہ شہر میں میرا کچا مکان باقی ہے

سلطان سکون زندگی کی مثبت قدروں کے پاسدار ہیں اور انھوں نے اپنی غزل میں بھی اس کا پرچار کیا ہے وہ بنیادی طور پر امن و سلامتی اور خوشگوار معاشرے کے متمنی ہیں اور اپنے اشعار میں اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

کعبہ بنایئے کہ کلیسا بنایئے
لیکن دل و نظر کو کشادہ بنایئے

اب پھر سے اس جہاں کو بنانے سے تو رہے
جو ہے بنا ہوا اسے اچھا بنائیے

کچھ اندھیرا گھٹا دیا جائے
اک دیا ہی جلا دیا جائے

محبت کی ابھی قدریں ہیں باقی
ابھی بن میں پپیہا بولتا ہے

سکوںؔ وقت کی گردش پہ ہے یقین مجھے
نہیں جو آج تو ہو گا ضرور کل میرا

رہے گی مل کے تجھے منزلِ مراد سکوںؔ
رہِ خلوص پہ جاری سدا سفر رکھنا

سلطان سکون کی غزل کا لہجہ بڑا منفرد اور دل آویز ہے انھوں نے زندگی کے سخت سے سخت تجربات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے اور ان کے شعروں میں حالات کی تلخی و ستم ظریفی پر بڑی گہری چوٹ بھی پڑتی ہے لیکن ان کا لہجہ تلخی کا شکار نہیں ہوتا۔ ان کے ہاں منفی اثرات کم ہیں جبکہ خلوص کی چاشنی ان کا سب سے بڑا کمال ہے۔ یہی چیز ان کے قاری کو مسحور کرتی ہے اور ان کے شعروں میں اس لیے تاثیر بھی ہے کہ شعر دل میں اترتے ہیں۔ جس پر آصف ثاقب یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"سلطان سکون کی غزل کا لہجہ دل میں تیر بن کر گرتا ہے وہ پر افشاں نہیں نکلتا بلکہ پیوست ہو کر لہو میں ایسا ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ جو دردمندی کی بے تابیوں سے خاص ہے یوں تو اچھی غزل کہنے والے بہت سے ہیں مگر سلطان سکون نے غزل کے لہجے کو جیسے بامراد کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔" (۱۰)

سلطان سکون نے غزل کو فنی و فکری ہر دو حوالوں سے ثروت مند کیا ہے۔ غزل کے سب لوازمات

کو برتا ہے۔ شاعری میں فکر و جذبہ، شعریت، لطافت کی کرشمہ سازی، سوز و گداز جل کر جو کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اسے تغزل کا نام دیا جاتا ہے۔ سلطان سکون کی شاعری بھی تغزل کی رنگارنگی سے مملو ہے اور ان کے ہاں وہ سارے عناصر موجود ہیں جو غزل کا خاصہ ہیں۔ جو غزل کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں۔ خود سلطان سکون کا تغزل کے حوالے سے یہ کہنا ہے:

تغزل حسن ہے صنفِ غزل کا
غزل ورنہ غزل کوئی نہیں ہے

اس حوالے سے سلطان سکون کی غزل کا جائزہ لیا جائے تو اس کے اندر تمام عناصر کی کرشمہ سازی نظر آتی ہے ان کے ہاں یہ فنی پختگی برسوں کی شعری ریاضت کا ثمر ہے آصف ثاقب نے اس حوالے سے یوں اپنی رائے پیش کی ہے:

> ''غزل میں جدت اور جدیدیت کے مفروضوں اور غزلیہ ظلمیت کے التزام کے اس دور میں سلطان سکون نے غزل کی خالص قدروں کی جانفشانی سے پاسداری کی ہے۔ تغزل کا یہ مضمون اور لب و لہجہ کا یہ سرمایہ کچھ اسی کا حصہ ہے۔''(۱۱)

بہت مٹھاس جو اپنی زباں میں رکھتا ہے
وہ ایک تیرِ ستم بھی کماں میں رکھتا ہے
ملے بھی وہ تو کبھی ٹوٹ کر نہیں ملتا
خلش ضرور کوئی درمیاں میں رکھتا ہے
ہوائیں اس کے لیے آندھیاں اٹھاتی ہیں
جو پیڑ ایک بھی پتا خزاں میں رکھتا ہے

سلطان سکون کی جس غزل کے اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں یہ غزل ۱۹۸۳ء کے بہترین ادب کے عالمی انتخاب میں شامل کی گئی۔ اس سے پہلے فنون میں شائع ہوئی اور وہیں سے ''لائق توجہ تحریروں'' کے اس انتخاب میں شامل ہوئی۔ جس کے مرتب کرنے والوں میں کشور ناہید، جاوید شاہین اور منو بھائی شامل تھے۔ اس کے علاوہ ناصر زیدی نے ۱۹۷۹ء، ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۱ء میں ملک بھر کے شعرا کی غزلوں کے انتخاب شائع کیے۔ تینوں سالوں میں سلطان سکون کی غزلیں

شاملِ انتخاب رہیں۔ یوں سلطان سکون کی غزل نے خود کو منوایا ہے۔ سلطان سکون کی غزل میں ایک تنوع ہے، ایک رنگارنگی ہے جو قاری کی سوچ میں انتعاش پیدا کرتی ہے:

یہی تو اس کا ہنر ہے کہ اپنی باتوں سے
ہر اک کو حلقۂ حسنِ گماں میں رکھتا ہے

ایک اور غزل کے یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

مجھے تو حشر سا برپا دکھائی دیتا ہے
یہ دور آپ کو کیسا دکھائی دیتا ہے
دکھائی کچھ نہیں دیتا جو دیکھنا چاہوں
نہ دیکھنا ہو تو کیا کیا کھائی دیتا ہے

سلطان سکون کی غزل میں کثرت سے ایسے اشعار ملتے ہیں جو غور و فکر پہ اکساتے ہیں۔ غزل میں ''تلمیح'' کا استعمال شاعر کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کے ساتھ ساتھ فکری رویے کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ ''تلمیح'' کے ذریعے کسی اشارے یا لفظ کے ذریعے کسی بہت معروف تاریخی واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے۔ جیسے علامہ اقبالؒ نے حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ کو شعر میں بیان کیا ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

سلطان سکون نے بھی بڑی خوبصورتی سے ''تلمیحات'' کا استعمال کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کہاں گئے ہیں شب گرد جو بدل کر بھیس
یہ دیکھتے تھے کوئی بے اماں نہ رہ جائے

حضرت عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں رات کو بھیس بدل کر مختلف علاقوں کا دورہ کرتے تھے تا کہ لوگوں کی پریشانیوں سے براہِ راست آگاہی ہو یہ اسی طرف اشارہ ہے۔

اب تسخیرِ قمر سے ہم پر بھید ہوا ہے یہ بھی روشن
سینے میں پتھر ہوتے ہیں صورت جن کی حسیں ہوتی ہے

وہ جس کے لیے قیس نے کی دشت نوردی
اب اپنی نمائش سر بازار کرے ہے

سلطان سکون نے اپنی غزل میں محاکات نگاری کے عمدہ کرشمے بھی دکھائے ہیں۔جدید اردو غزل اس حوالے سے ثروت مند ہے کہ اس میں پیکر تراشی اور جدید شعری امیجز کے ذریعے حسن آفرینی پیدا کی گئی ہے۔سلطان سکون کا تعلق جس خطے سے ہے یہاں قدرتی حسن کے ایسے مظاہر ہیں جو تخیل کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں لہٰذا سلطان سکون نے ان مظاہر سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اپنی غزل کے حسن کو دوبالا کیا ہے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

جھیلیں جھرنے، وہی جنگل وہی قینچی کی صدا
اپنے اندر کبھی کاغان بھی ہو جاتا ہوں

ایبٹ آباد کی رونق ہے انھی کے دم سے
سبزہ و گل، یہ حسیں لوگ، یہ بادل بارش
کبھی بھولیں گے نہ وہ نتھیا گلی کے دن رات
وہ میں، وہ تم، وہ گھنی دھند، وہ جنگل بارش

حسیں فضائیں حسیں گھٹائیں حسین موسم حسیں نظارے
تمھیں یہ منظر دکھائیں گے ہم اگر تم آئے کبھی ہزارے
اگر نہ دیکھے ہوں ایسے منظر تو میری وادی میں آ کے دیکھو
سروں پہ پھیلی ہوئی گھٹائیں زمیں پہ اترے ہوئے ستارے

سلطان سکون نے بڑی خوبصورتی سے یہ مناظر پیش کیے ہیں۔الفاظ کے ذریعے مصوری کے ایسے ایسے نمونے پیش کیے ہیں جن کی مثال کم کم ہی نظر آتی ہے۔سروں پہ پھیلی گھٹائیں، زمیں پہ اترے ستارے، بارش برسنے کے مناظر بالکل آنکھوں کے سامنے گھوم جاتے ہیں۔احمد فراز کی "ایبٹ آباد" کے نام سے ایک نظم شعری مجموعے "تنہا تنہا" میں شامل ہے۔
اس کے تین اشعار کچھ یوں ہیں:

ابھی تلک ہے نظر میں وہ شہر سبزہ و گل
جہاں گھٹائیں سرِ راہگزار جھومتی ہیں
جہاں ستارے اترتے ہیں جگنوؤں کی طرح
جہاں پہاڑوں کی قوسیں فلک کو چومتی ہیں
تمام رات جہاں چاندنی کی خوشبوئیں
چنارو سرو کی پرچھائیوں میں جھومتی ہیں

ایسے ہی خوبصورت امیجز ہمیں سلطان سکون کی غزلوں میں بھی دکھائی دیتے ہیں جہاں چاندنی آ کر ان کے ساتھ خاک نشیں ہوتی ہے۔ ایسے مناظر کو عمدگی سے پینٹ کیا گیا ہے:

اتنا کم تر بھی تو نہ جانیں ہم سے خاک نشیں لوگوں کو
شب کو اتر کر چاندنی ساتھ ہمارے خاک نشیں ہوتی ہے

کبھی ہوا نے جو میرے در پہ دستک دی
کہا یہ دل نے کہ اٹھ جا کے دیکھ آ کوئی ہے

الفاظ کی اتنی عمدہ نشست و برخاست اور ایسا توازن، سلطان سکون کی غزل کا خاص وصف ہے۔ جو انھیں اپنے معاصر غزل گو شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کے الفاظ سادہ ہیں لیکن پُر تاثیر ہیں۔ جو ان کی غزل میں ایک خوبصورت فضا پیدا کرتے ہیں۔

ان کے ہاں سہل ممتنع کی بھی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ میر سے لے کر ناصر کاظمی اور عبدالحمید عدم تک بہت سارے شعرا کے ہاں ایسی شاعری کے نمونے ہیں اور یہی التزام سلطان سکون کی غزل میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ان کے اس وصف کو پروفیسر محمد ارشاد نے یوں اجاگر کیا ہے:

"ان کی شاعری شستہ، شائستہ اور مہذب افکار کا اظہار ہے اور وہ اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے بہت سے اشعار سہل ممتنع کے درجے پر فائز ٹھہرتے ہیں۔ اچھے شعر کی ایک خوبی یہ بھی گنی گئی ہے کہ اس کی نثر نہیں کی جا سکتی۔"(۱۲)

سلطان سکون کی غزل میں سہل ممتنع کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں:

مری مشکل کا حل کوئی نہیں ہے
تیرا نعم البدل کوئی نہیں ہے

شہر میں مان بڑھا جاتا کچھ میرا بھی
جاتے جاتے میرے بھی گھر ہو جاتا

وہ عمر بھر کی رفاقت کا اتنا پھل دے گا
دکھوں پہ صبر کی تلقین کر کے چل دے گا

آپ بیتی کہیں کہ سب بیتی
ہم سی لیکن کسی پہ کب بیتی

اکثر خوشی بھی ہم سے رہی ہے گریز پا
اکثر خوشی کو ہم بھی میسر نہ آئے تھے

سلطان سکون نے ایک عمر کی ریاضت کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے کہ ان کی غزل کو معاصرین و مشاہیر نے خوب سراہا ہے۔ان کی غزل میں حسن و دلکشی کے سارے لوازمات موجود ہیں۔الفاظ ومحاورات کا خوبصورت استعمال نئی نئی علامتیں اور ان علامتوں کو نئے مفاہیم سے آشنا کرنا ان کا کمال ہے۔

گھر، شجر، دریا، ستارہ، پپیہا، صحرا، منڈیر، کا علامتوں کے طور پر استعمال کیا اور ان سے نئے مفاہیم کشید کیے گو ان میں بعض بہت عام فہم اور مستعمل ہیں لیکن سلطان سکون نے ان کو سادگی و پرکاری سے استعمال کیا ہے۔لہٰذا وہ غزل کے شعروں میں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ان کی غزلوں میں ایک خاص طرح کا آہنگ اور موسیقیت نظر آتی ہے اور اس کے لیے وہ بعض جگہوں پر اشعار میں اور بعض دفعہ ایک ایک مصرعے میں تکرار لفظی سے کام لیتے ہیں۔جس سے ان اشعار میں باقاعدہ ایک لے ہے اور ایک لطافت پیدا ہوتی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مضمحل مضمحل ساون بیتا
مضطرب مضطرب سی شب بیتی

کچھ اس ادا سے کچھ ایسے ہنر سے اترے گا
کہ عمر بھر نہ وہ قلب ونظر سے اترے گا

جب تک حصارِ ذات سے باہر نہ آئے تھے
منظر کئی نظر پسِ منظر نہ آئے تھے

اجاڑ اجاڑ سے شاعر بجھے بجھے سے یہ لوگ
یہی تو رونقِ ہستی بحال رکھتے ہیں

اور یہ غزل تو ایسے اشعار کی کثرت سے مالا مال ہے اور حسن آفرینی میں اپنی مثال آپ ہے:

کوئی چاؤ ہے نہ لگاؤ ہے نہ بناؤ ہے
نہ جواب ہے نہ سوال ہے یہ ملال ہے
کوئی رنگ ہے نہ ترنگ ہے نہ امنگ ہے
نہ وہ ذوق و شوق بحال ہے یہ ملال ہے
یہاں جس کا حال بھی پوچھیے وہ یہی کہے
یہ ملال ہے وہ ملال ہے یہ ملال ہے

سلطان سکون نے محض لفظوں کے تکرار سے اشعار میں خوبی پیدا نہیں کی بلکہ انھوں نے ایک ہی لفظ کو ایک مصرعے میں کس خوبصورتی سے علاحدہ علاحدہ معنی میں استعمال کیا جو انھی کا کمال ہے اور یہ ہنر زبان و بیان پہ کامل دسترس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے ایک عمر کی مسلسل محنت اور لگن سے غزل میں یہ کمال حاصل کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کی اپنی ایک پہچان ہے۔

انھوں نے روزمرہ استعمال ہونے والے محاورات کو بھی اشعار میں اس خوبی سے استعمال کیا ہے کہ ان کی تفہیم کا نیا زاویہ پیدا ہوگیا ہے:

پاس آکر احباب کے یہ تصدیق ہوئی
سچ ہے دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں

اب دکھاتے ہو خلوص و دوستی کے سبز باغ
جب خزاں آئے گی مجھ پر تم ہوا ہو جاؤ گے

دور کے ڈھول سہانے اور سبز باغ دکھانا جیسے محاوروں کو کتنی چابکدستی سے غزلیہ اشعار میں استعمال کیا گیا ہے یہی سلطان سکون کا کمال ہے۔ سلطان سکون کی غزل کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ ہر دو لحاظ سے جدید اردو غزل میں خوبصورت اضافہ ہے۔ انھوں نے روایتی غزل سے استفادہ کرتے ہوئے اور غزل کے جدید معیارات کو سامنے رکھتے ہوئے اردو غزل میں کئی اضافے کیے ہیں اور اس کے لیے اپنی عمر کی کئی دہائیاں اس ریاضت میں لگا دیں۔

ان کی غزل سادگی و پرکاری کی ترجمان ہے جس میں ہمیں اردو غزل کے سارے رنگ نظر آتے ہیں۔ سلطان سکون کی شاعری ان کی شخصیت کی آئینہ دار ہے اور اس کو انھوں نے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ جس کا اعتراف اہلِ فن نے کھلے دل سے کیا ہے۔ جس کا اظہار ان کے اشعار میں یوں ہوتا ہے:

جگر کے خون سے ہر شعر تر بتر کیا ہے
تو پھر دلوں پہ کسی شعر نے اثر کیا ہے
کہاں کی شاعری یہ شاعری نہیں ہے سکون
دکھوں کو اپنے ہنر سے ادھر ادھر کیا ہے

اور یہ شعر ان کی سچائی پر دال ہے:

متاعِ شعر و سخن کیوں نہ ہو عزیز ہمیں
کہ عمر بھر میں بہم اک یہی خزانہ کیا

ب: سلطان سکون کی منظومات

سلطان سکون نے شاعری کی تمام مروجہ اصناف کو ذریعۂ اظہار بنایا گو کہ ان کی بنیادی پہچان غزل ہے لیکن انھوں نے حمد، نعت، سلام، نظم اور گیت نگاری کے جوہر بھی خوب دکھائے ہیں۔ ان کی شاعری میں یہ سارے رنگ موجود ہیں لہٰذا ان کا مختصر جائزہ سلطان سکون کے فنِ شعر کی تفہیم کے لیے ضروری ہے۔

حمد:

سلطان سکون نے اردو اور ہندکو شاعری میں ملک گیر شہرت حاصل کی۔ انھوں نے بڑے منفرد انداز میں حمد نگاری کا آغاز کیا۔ اپنے پہلے شعری مجموعے "کوئی خواب ہے نہ خیال ہے" کا آغاز ہی حمد سے ہوتا ہے اور یہ مروجہ اصولوں کے برخلاف یوں ہوتا ہے کہ کتاب کھولیں اور سب سے پہلے حمد پڑھیں، پھر نعت شریف اور اس کے بعد باقی کتاب کا تعارف اور دیگر لوازمات سے قاری آشنا ہوتا ہے۔ ابتدائی حمد کے اشعار بھی ان کی عاجزی کا بھرپور اظہار ہیں:

ابتدا تو ہے انتہا تو ہے
ہر کجا تو ہے جا بجا تو ہے
اپنے بارے میں کیوں میں خود سوچوں
میرے بارے میں سوچتا تو ہے

یہ ایک طرف خدائے بزرگ و برتر کی کبریائی کا بیان ہے تو دوسری طرف بندے اور خدا کے تعلق کو بھی بڑی خوبصورتی سے اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ تو رگِ جاں سے بھی نزدیک تر ہے لہٰذا اس سے انسان کا کوئی عمل اوجھل نہیں ہے۔

اپنے عجز کی وضاحت شاعر نے یوں کی ہے:

میں تیری حمد کیا لکھوں یارب
حمد سے میری ماورا تو ہے

ایک اور حمد پروردگارِ عالم کی شان و عظمت اور ان کی قدرت و خالقیت کے اظہار سے بھرپور ہے:

تو ہی تو ہے یگانہ و یکتا
کوئی تیرا نہ دو بدو اللہ
ایک ننھے سے پھول میں تو نے
بھر دیے کتنے رنگ و بو اللہ
اس کو تو بھی پسند کرتا ہے
عاجزانہ ہو جس کی خو اللہ

عاجزی بلاشبہ ایسی صفت ہے جس سے بندہ مخلوق میں بھی عزت و آبرو کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اپنے پروردگار کے ہاں بھی وہ پسندیدہ شمار ہوتا ہے۔اس طرح مقطع میں سلطان سکون نے اس جرأت کا اظہار کیا ہے کہ زبان پہ ہمیشہ حمد ہی ہے:

حمد لب پہ رہے سکون یہی
اللہ ہو اللہ،اللہ ہو اللہ

نعت شریف:

سلطان سکون نے حمد کے ساتھ ساتھ نعت کا بھی اہتمام کیا ہے اور اپنی بھرپور عقیدت مندی و وارفتگی کا اظہار کیا ہے عام طور پر نعت لکھنا دودھاری تلوار پر چلنے کے مترادف ہے کہ یہ بہت احتیاط پسندی کا تقاضا کرتی ہے لیکن سلطان سکون نے بڑی سہولت سے اس منزل کو بھی سر کیا ہے:

مجھ سے کیا ہو بیان حضور کی شان
میں کہاں اور کہاں حضور کی شان

سلطان سکون نے انکسار کے ساتھ اپنی کم مائیگی کا بھی اظہار کیا ہے نہایت سادہ اور پُر اثر الفاظ میں اتنی خوبصورت نعت کہنا، یہ بڑی ریاضت کے بعد نصیب ہوتا ہے۔نعت کے یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں:

جب خدا کو بھی نہ منظور تھی دوئی تیری
کیسے ممکن تھا کہ ہوتا کوئی سایہ تیرا
اے حرا یاد بہت تجھ کو بھی آتا ہوگا
جس نے روشن رکھا اک عمر اندھیرا تیرا

یہ اشعار سلطان سکون کی قلبی واردات کا بہترین اظہار یہ ہیں۔ بڑا خوبصورتی تلمیحاتی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ حرا کو اس کا شرف یاد دلایا گیا ہے کہ کیسے اس کے اندھیروں کو حضور ﷺ نے نور سے بھر دیا ہے اور اولین وحی کا شرف بھی اس کے حصے میں آیا۔

سلطان سکون نے حمد و نعت کے بعد نوسۂ رسول ﷺ کے حضور سلام بھی پیش کیا ہے۔ ان کے سلام میں حق و باطل کے اس عظیم معرکے میں حضرت امام حسینؓ کی عظیم قربانی کو بڑے دلکش انداز میں اشعار کا روپ دیا گیا ہے۔ دو اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

جلا کر مشعلیں اپنے لہو کی
سجا کر حق کے بام و در گیا ہے
عبادت کو رہے گا ناز جس پر
حسینؓ ایک ایسا سجدہ کر گیا ہے

حسینؓ کی اس عظیم قربانی کو دنیا بھر میں علامت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ جو اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ کبھی بھی حق کفر و الحاد کے آگے نہیں جھکتا۔

نظم نگاری:

اُردو شاعری میں نظم کی ایک طویل روایت ہے اور یہ ابتدا سے غزل کے ساتھ ساتھ سفر کر رہی ہے اور کوئی ایسا دور نہیں گزرا کہ غزل کے ساتھ اعلیٰ پائے کی نظم نہ لکھی گئی ہو۔ اس حوالے سے اردو نظم نے کئی سنہرے دور دیکھے ہیں اور ایک سے بڑھ کر ایک نظم گو شاعر گزرا ہے۔ غزل کی مخالفت کے دور میں نظم کو خصوصی طور پر اجاگر کیا گیا۔ جدید اردو شاعری کے نام سے محمد حسین آزاد اور حالی نے نظم نگاری کو فروغ دیا۔ پھر اس کو عروج علامہ اقبالؒ کے ہاتھوں نصیب ہوا۔

ترقی پسند تحریک نے اس کے مزاج کو بدل کر اس میں نئے موضوعات، نیا اسلوب، نیا دکشن دیا ور تا حال نظم کئی مراحل طے کر چکی ہے۔ سلطان سکون نے بھی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ نظم نگاری بھی کی اور آپ نے زیادہ تر پابند اور موضوعاتی نظمیں لکھیں۔ ''کوئی ہے'' کے نام سے شائع ہونے والے ان کے دوسرے شعری مجموعے میں چند نظمیں شامل کی گئیں ان میں بیوٹی پارلر، ہوائے شہرِ جاناں اور مجسم کھا آزاد نظمیں ہیں۔ جبکہ ''پہیلی'' کے نام سے شامل پابند نظم کا موضوع ''عورت'' ہے۔ سلطان سکون نے

عورت کو ایک "سہیلی" سے تشبیہ دی ہے اور اس کے مختلف روپ بھی بڑی عمدگی سے پیش کیے ہیں:

ایک عورت کے دم سے روشن ہے
بزمِ ہستی کا آئینہ خانہ
ہو نہ عورت تو یہ جہاں کیا ہو
ایک صحرا ہو یا کہ ویرانہ

یعنی "وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ" والا معاملہ ہے اور آگے جو عورت کی حیثیتیں بیان کی ہیں وہ اس کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

ایک ماں ہے بہن ہے بیٹی ہے
ایک بیوی ہے اک سہیلی ہے
بوجھ سکتا نہیں کوئی جس کو
ایک عورت ہی وہ پہیلی ہے

غزل کی ہیئت میں ایک نظم بیادِ مہدی حسن اور ایک بیادِ احمد فراز بھی شامل ہیں اور سلطان سکون کی زیادہ تر نظمیں غزل ہی کی ہیئت میں ملتی ہیں۔ ان کی نظموں کا حال ہی میں شائع ہونے والا مجموعہ "کچھ پھول عقیدت کے" اس کا ثبوت ہے۔ اس مجموعے میں مردِ قلندر (اقبالؔ)، بابائے قوم، روداد، مادرِ ملت، پاکستان، پاک وطن جیسی خوبصورت تاثراتی نظمیں بھی شامل ہیں۔ جو ان کی وطن اور بانیانِ وطن سے بھرپور محبت کا اظہار ہیں اور دوسری طرف اپنے محسنینِ شعر وسخن احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور احمد فراز کے لیے عقیدت کے پھول نچھاور کرتی نظمیں بھی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی "دیوار لفظوں کی" پوری امتِ مسلمہ کے حالات کا نوحہ بھی ہے اور سلطان سکون کے جذبات واحساسات کی عکاس بھی نظم کی چند لائنیں ملاحظہ ہوں۔

میں کیا لکھوں
میں کس کس ملک کے مسلم کے حالِ زار پر
آنسو بہاؤں اور اپنا دل جلاؤں
وہ کشمیری ہوں، افغانی
فلسطینی، عراقی یا کہ لبنانی

وہ چاہے رونگیا ہوں یا وہ شامی
میں کس کس کے دکھوں کا ماجرا لکھوں

یہ نظم پوری امتِ مسلمہ کے دُکھ درد سے متعلق ہے اور سلطان سکون کے دلی جذبات کا بھرپور اظہار ہے وہ بحیثیت مسلمان پورے عالم کے مسلمانوں کے دکھ درد میں اپنی آواز شامل کر رہے ہیں اسی نظم میں سلطان سکون نے آگے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ میں مسلمانوں کے کسی گروہ کی طرف لڑتا ہوا کسی گولی کا نشانہ بن جاؤں۔

نظم ''مردِ قلندر'' شاعرِ مشرق کے لیے نذرانہ عقیدت ہے۔ جس میں علامہ اقبالؒ ہی کے اسلوب بیان کو اختیار کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا ہے:

ترے سخن سے ہوا سنگ میں شرر پیدا
ترے سخن سے دلوں میں ہوا اثر پیدا
ہزاروں سال بھی گریہ کناں رہے نرگس
نہ شاید اب کوئی تجھ سا ہو دیدہ ور پیدا

اور اس کے بعد علامہ کی سوچ وفکر اور ان کے فلسفہ کو سلام پیش کرتے ہیں:

ترے سخن کو تری سوچ و فکر و فن کو سلام
اے آفتاب خودی تیری ہر کرن کو سلام

بابائے قوم کے حضور نظم ''روداد'' پیش کی ہے جس میں بحیثیتِ قوم اپنی کوتاہ اندیشی اور اپنے جرم کا اعتراف کیا ہے کہ ہم تیرے دیے تحفے، ملکِ پاکستان کی حفاظت نہ کر سکے:

یہ تیرا بارِ امانت بھی ہم اٹھا نہ سکے
جو تجھ سے عہد کیا تھا اسے نبھا نہ سکے
عمل پہ اپنے نہایت ہی شرمسار ہیں ہم
تیرے حضور ہم آئے ہیں قائدِ اعظم
بتا کہ تو نے دیا تھا جو یہ وطن پیارا
صد حیف کر دیا ہم نے اسے بھی دوپارہ
فسردہ رکھتا ہے کیا کیا یہ دُکھ ہمیں ہر دم
ترے حضور ہم آئے ہیں قائدِ اعظم

سلطان سکون نے وطن کے دولخت ہونیکا المیہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہ جو ایک احساسِ ندامت ہے۔ اس کا برملا اظہار کیا ہے۔ شاعر، ادیب اور فنکار اپنے دُکھ کے اظہار کے لیے اپنے فن کو بروئے کار لاتا ہے اور اپنا تزکیہ کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کو بھی آئینہ دکھاتا ہے۔ وطن سے محبت کے لیے ان کی نظم "میری پہچان" کے اشعار پیش ہیں:

مرے وطن ترے ہونے سے میرا ہونا ہے
یہ تیرے سنگ ہیں گوہر یہ مٹی سونا ہے
یہ نانِ خشک جو بڑھ کر ہے خوانِ نعمت سے
یہ سر زمین مرا مخملیں بچھونا ہے

عقیدت کے یہ پھول ان کے جذبۂ وطنیت کا پرخلوص اظہار ہیں۔ سلطان سکون جیسے بزرگ اس ملک کے حصول کے عینی شاہد ہیں لہٰذا وہ اس قدر و قیمت سے بخوبی آگاہ ہیں جس کا اظہار وہ بڑے خلوص او ر دیانتداری سے کرتے ہیں۔ سلطان سکون کی نظم نگاری زیادہ تر انھی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ انھوں نے بغیر کسی کی تقلید کیے اپنی کدو کاوش سے یہ خوبصورت موتی پروئے ہیں۔ نظم کے مقابلے میں ان کی غزل زیادہ توانا ہے۔ ان کی نظمیہ شاعری بھی اردو شعری سرمائے میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

انھوں نے نہایت سادہ اسلوب اپنایا ہے اور بڑی آسانی سے ایک طرف وطن اور بانیانِ وطن سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے تو دوسری طرف اپنے احباب اور معاصرین پر عقیدت کی چیتاں نچھاور کی ہیں۔

احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، احمد فراز، افتخار عارف، سید بشیر حیدر کنول، صوفی عبدالرشید، غلام جان خان طاہر خیلی، حفیظ اثر، مہدی حسن اور ابرار سالک جیسے دوستوں کا سراپا آپ کو سلطان سکون کی نظموں میں نظر آئے گا۔ ان کی شخصیات کے اوصاف اور کارناموں کو بھی نظم کا روپ دیا گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

کشور شعر و سخن کی ہے پہچان قتیل شفائی
دیس ہزارہ کا ہے فخر و مان قتیل شفائی

بشیر حیدر کنول کے لیے:

خوش رو تھے، خوش قبا تھے، خوش وضع خوش ادا تھے
فی الواقعہ کنول تھے سید بشیر حیدر

پروفیسر صوفی عبدالرشید:

استاد علم و فن تھے
اک ماہر سخن تھے
خوش طبع خوش چلن تھے
خود میں اک انجمن تھے
کالج کا بانکپن تھے
صوفی رشید صاحب

واحد سراج کے لیے:

ماہر تعلیم بھی ہے میر بزم علم و فن
جس کے دم سے شہر میں ہے رونق شعر وسخن

راج کرتا ہے دلوں پر خلق اور اخلاص سے
خوش دلی سے پیش آتا ہے وہ عام و خاص سے

حفیظ اثر کے لیے:

یاد آئے گا جب بھی سکون حفیظ اثر
شعر و سخن کا دور پرانا یاد آئے گا
مہدی حسن کے لیے نظم کے دو اشعار:
میرے مہدی جی شہنشاہ غزل تیرے بعد
کوئی ملنے کا نہیں تیرا بدل تیرے بعد
تیرا سجادہ نشیں کوئی نہیں آنے کا
ہوا سنسان غزل کا وہ محل تیرے بعد

اپنے احباب سے اظہار محبت کا یہ انداز شاید معاصر اردو شاعری میں خال خال ہی نظر آئے۔ انھوں نے خوبصورت انداز سے اپنے احباب کی تصاویر پیش کی ہیں اور یہی سلطان سکون کی نظم نگاری کا کمال ہے۔

ج: سلطان سکون کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری

ہم ابتلا ومصائب کے جس عہد میں سانس لے رہے ہیں اس میں ہر طرف مسائل ومصائب کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ زندگی کے گوناں گوں مسائل نے ہر شخص کو جکڑ رکھا ہے۔ ایسے میں اگر کہیں سے کوئی شگوفہ پھوٹتا ہے، کوئی کلی چٹکتی ہے، کوئی قہقہہ بلند ہوتا ہے تو لوگ اس کو غنیمت سمجھتے ہیں کیوں کہ اس کی ہمارے معاشرے کو اَشد ضرورت ہے۔

سلطان سکون نے اردو غزل کی زلفیں سنوارنے اور ہند کو شعر وادب میں مستغرق رہنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کی ایک اور خدمت کا بیڑا اٹھایا اور اپنے اردگرد پھیلی گھٹن کو کم کرنے کے لیے طنز ومزاح کی پھلجھڑیوں کا اہتمام کیا ہے۔ ان کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کا مجموعہ ''کوئی ہنستا دکھائی دے'' کے نام سے آسمانِ ادب پر طلوع ہوا تو قارئین ادب کو خوشگوار حیرت ہوئی۔

سلطان سکون نے طویل ومختصر نظموں اور قطعات کی صورت میں اردگرد پھیلے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

مزاح کے بارے میں پروفیسر انور مسعود نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا ''مزاح سے اٹھنے والے قہقہے کو اگر نچوڑا جائے تو اس میں سے آنسو ٹپک پڑیں۔'' گویا مزاح نگار خارجی دنیا کے دکھوں سے سینہ فگار ہوتا ہے تو اس کے ہاں مزاح کی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ جس سے وہ اپنے ذاتی تزکیہ کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لیے آسودگی کا سامان پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ سلطان سکون کے ہاں بھی ہمیں ایسی ہی صورتِ حال دکھائی دیتی ہے انھوں نے بڑے خوبصورت انداز میں معاشرتی مسائل کی تصویر کشی کی ہے۔

ان کے موضوعات کرائے کا مکان، خاندانی منصوبہ بندی، پانی کی کہانی، پولنگ، گھر کا بجٹ، کلرک، پٹواری، بے کیشن، مٹی کا تیل، سگریٹ نوشی، انتخابی منشور، شعبۂ حادثات وغیرہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ سلطان سکون نے ہماری روزمرہ کی زندگی کے مسائل پر نشتر زنی کی ہے۔ یہ مسائل کی وہ دلدل ہے جس میں عام آدمی پھنسا ہے اور اس کے ہنسنے ہنسانے کے مواقع کم ہی میسر ہیں۔ بقول سلطان سکون:

اب کا یہ دور ایسا پر آشوب دور ہے
ہر آدمی ہنسی کو ترستا دکھائی دے
ہم نے سکون لکھے ہیں کچھ شعر اس لیے
ہم پر سہی ہمیں کوئی ہنستا دکھائی دے

گویا سلطان سکون نے دانستہ طور پر عوام کو ہنسانے کا بندوبست کیا ہے۔ چوٹ لگانے کے لیے خود کو پیش کیا ہے اور آئینہ پورے معاشرے کو دکھایا ہے۔ نظم ''کرائے کا مکان'' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

بہت یقین دلایا مکان ملنے کا
تو ہم خوشی سے روانہ ہوئے وہاں کے لیے
ہوا وہ گھر سے برآمد جو انتظار کے بعد
تو ہم نے بڑھ کے قدم مالکِ مکاں کے لیے
سنی جو شرح کرایہ تو کر گئے پرواز
ہمارے ہوش و خرد دوسرے جہاں کے لیے

نظم ''خاندانی منصوبہ بندی'' کا آغاز یوں ہوتا ہے:

یا رب کوئی نہ اتنا کثیر العیال ہو
وہ جن کا ایک گھر میں سمانا محال ہو

سلطان سکون نے اپنے عہد کے زندہ مسائل پر قلم اٹھایا ہے اور مزاح کے پردے میں خوبصورت انداز میں اصلاح احوال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ عبدالحمید عدم کی ایک بہت معروف غزل کی پیروڈی ''ہزل'' بھی ہماری کج ادائیوں پر چوٹ ہے:

چلو ناک تو تیری اونچی ہوئی
گلا ہے وہ قرضے اٹھانے ترے
ہوئیں ختم شادی کی جب رونقیں
تو ہوش آئیں گے پھر ٹھکانے ترے

یہ سب ہمارے سامنے کے وہ مسائل ہیں جن سے ہمارا روزمرہ زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ یہ

معاشرتی ناسور ہیں جنھوں نے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کردیا ہے اور اس پر کوئی سچا فنکار ہی چوٹ لگا سکتا ہے۔ یہ سلسلہ ہر دور میں رہا ہے اور شعراء نے ایسی معاشرتی برائیوں کو طنز و مزاح کی صورت میں اجاگر کیا ہے۔ سلطان سکون بھی اسی روایت کا حصہ ہیں اور بقول ڈاکٹر صغیر خان:

''سلطان، اکبر سے شروع ہو کر ضمیر جعفری سے ہوتی ہوئی انور مسعود تک پہنچنے والی ظریفانہ ادبی روایت کا پالنہار ہے اور اس راہ کا سنجیدہ و باوقار راہی ہے اللہ اس کا سفر باقی رکھے کہ ہمیں اس جیسوں کی لوڑ ہے۔'' (۱۳)

بلاشبہ سلطان سکون یہ فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں اور کئی برس سے کر رہے ہیں۔ ان کے قطعات ہفت روزہ ''شمین'' ایبٹ آباد میں شائع ہو کر عوام سے داد وصول کرتے رہے ہیں۔ یہ قطعات فنی و فکری ہر دو لحاظ سے فن شعر کا سرمایہ ہیں کہ ان کا تعلق زندگی سے جڑے مسائل سے ہے۔

''سڑک'' کے زیرِ عنوان قطعہ ملاحظہ ہو:

سڑک جو دور میں انگریز کے تعمیر کردہ تھی
اکھاڑی ہے مہینوں میں کرینوں کی مشینوں سے
سڑک پھر پی ڈبلیو ڈی نے جو تعمیر کی اس پر
اکھڑتی جارہی ہے خود بخود ہی کچھ مہینوں سے

یہ مسائل ہم سب کی نظروں کے سامنے ہیں اور معاشرے کا ہر فرد ان سے دوچار ہے لیکن شاعر کا کمال یہ کہ وہ ان پر بے لاگ رائے زنی کر کے ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ سلطان سکون نے نہایت سادہ اور دلکش انداز میں اس کو اجاگر کیا ہے۔ سلطان سکون کے قطعات پر جان عالم یہ رائے پیش کرتے ہیں:

''ان کے قطعات میں متفرق مسائل کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ شعروں میں پیش کیا گیا ہے اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان روزمرہ مسائل یا معاشرتی خرابیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی شاعرانہ فضا قائم رکھی گئی ہے۔'' (۱۴)

سلطان سکون نے بڑی سہولت سے عوام کے دلوں کی بات کو شعروں کا روپ دے کر ہنستے ہنساتے بڑے بنیادی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ یوں وہ طنز و مزاح کے اس قبیلے کے فرد بن گئے ہیں جو اردو شاعری کے سنجیدہ قافلے کے ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔ شاعر اپنے ساتھ ہونے والی واردات کو کس سلیقے سے شعروں کا روپ دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

نہ بھولیں گے کبھی یہ دورِ محشر ہم نہ بھولیں گے
کوئی دن لے کے اپنے ساتھ آسانی نہیں آتا
کبھی چینی کی قلت ہے کبھی ہے ڈالڈا غائب
کبھی بجلی نہیں آتی کبھی پانی نہیں آتا

سلطان سکون نے بڑی فنکارانہ چابکدستی سے عوامی مسائل کو قرطاس پر بہ انداز دگر منتقل کیا ہے کہ اس سے کچھ چہروں پہ مسکراہٹ کی خوشبو بکھر جائے اور اپنے اندر کا کرب بھی کسی حد تک کم ہو سکے۔ سلطان سکون نے مستقل طور پر مزاح نگاری نہیں کی بلکہ جب کبھی تلخیء حالات کا شکار ہوئے تو بے ساختہ ان کے اندر کا فنکار جاگ اُٹھا اور یوں وہ ایک بدلے ہوئے سلطان سکون نظر آئے۔ ''پی ایچ ڈی'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

یہ پوچھا مجھ پہ پی ایچ ڈی کوئی کرنا اگر چاہے
اسے اس سلسلے میں کام کیا کرنا ضروری ہے
وہ بولے مسکرا کر کام جو ہے بعد میں ہوگا
مگر پہلے اصولاً آپ کا مرنا ضروری ہے

سلطان سکون نے بڑی نفاست اور دھیمے انداز میں سادہ الفاظ میں مزاح پیش کیا۔ انھوں نے کہیں بھی شائستگی کا دامن نہیں چھوڑا اور یوں ایک کامیاب مزاح نگار کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ انھیں طنز و مزاح سے ایسی رغبت ہوئی کہ اب سین سین سرحدی کے نام سے ان کے طنزیہ و مزاحیہ قطعات ماہنامہ ''الحمرا'' لاہور کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مجنوں گورکھپوری، شعر اور غزل، مشمولہ: ''اردو شاعری کا فنی ارتقاء'' از ڈاکٹر فرمان فتح پوری، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۶۳۔۶۵

۲۔ محمد خان اشرف، ولی کا لسانی اور فنی شعور، دیباچہ ''دیوان ولی'' مرتبہ محمد خان اشرف وحسرت موہانی، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۳

۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''محمد تقی میر''، انجمن ترقی اردو، کراچی ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۲

۴۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، غالب کا فن، ادارہ ادب وتنقید، لاہور، جون ۱۹۸۷ء، ص ۲۷۰

۵۔ نجیب جمال، اقبال کی غزل ۔ایک جائزہ، مشمولہ: ''اقبال اور کلام اقبال'' مرتبہ، مرزا ظفر الحسن و مشفق خواجہ، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۳۰

۶۔ سلطان سکون سے انٹرویو از اختر سعیدی، روزنامہ ''جنگ'' کراچی، مڈویک میگزین، مورخہ ۱۳ اگست ۲۰۰۳ء

۷۔ صادق زاہد، ''تاثرات وتجزیات''، الحمد پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۵۱۱

۸۔ احمد ندیم قاسمی، کوئی خواب ہے نہ خیال ہے از سلطان سکون، ورڈ میٹ، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

۹۔ شبنم رومانی، کوئی خواب ہے نہ خیال ہے، از سلطان سکون، ورڈ میٹ، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

۱۰۔ آصف ثاقب، کوئی خواب ہے نہ خیال ہے، از سلطان سکون، ورڈ میٹ، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳

۱۱۔ آصف ثاقب، غزل کا سکون ۔سلطان سکون، مشمولہ: ماہنامہ ''آفرش''، ایبٹ آباد، دسمبر ۱۹۹۷ء، ص ۹

۱۲۔ محمد ارشاد، کوئی خواب ہے نہ خیال ہے، از سلطان سکون، ورڈ میٹ، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۱۶

۱۳۔ خان، محمد صغیر، ڈاکٹر، سکون کا ستون، مشمولہ: ''روزنامہ نوائے وقت''، راولپنڈی ۔اسلام آباد، ۳ مئی ۲۰۱۷ء

۱۴۔ جان عالم، کوئی بستا دکھائی دے، تبصرہ مشمولہ: سہ ماہی ''شعر وسخن''، مانسہرہ، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص ۸۳

سلطان سکون کی اُردو نثر

سلطان سکون کی نثر کے حوالے سے تا حال کوئی با قاعدہ کتاب منظرِ عام پر نہیں آئی تاہم ان کی نثر کے کئی نمونے مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہونے والے مضامین، کتابوں کے پیش لفظ، دیباچے، فلیپ اور سب سے بڑھ کر خطوط کی صورت میں موجود ہیں۔ انھوں نے اپنی ساری توجہ اُردو اور ہندکو شعروادب کی طرف مبذول رکھی۔ اور اس ذخیرے میں گراں قدر اضافے کیے ورنہ اگر وہ اُردو نثر کی طرف توجہ دیتے تو ہمیں ان کی نثر کے اعلیٰ نمونے نظر آتے۔ خود انھیں بھی اس بات کا احساس ہے جس کا اظہار انھوں نے غازی علم الدین کے نام اپنے ایک خط میں کیا ہے کہ وہ نثری ادب کا مطالعہ نہیں کر سکے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ میری محرومی اور بدقسمتی رہی کہ میں نثری (علمی) کتابوں کا مطالعہ نہیں کر سکا اس کی ایک وجہ تو یہ کہ میرا رجحان زیادہ تر شاعری کی طرف رہا اور بہت سا وقت غمِ دوراں کی نذر ہوتا رہا۔ پھر درمیان میں میری توجہ ہندکو زبان کے لوک ادب کو محفوظ کرنے کی طرف ہو گئی۔ اب اس محرومی پر افسوس ہو رہا ہے کہ مجھے علمی نثری کتابوں کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے تھا''۔(۱)

اس کے باوجود انھوں نے بڑی رواں اور سادہ نثر لکھی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے انھوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک سلسلہ ''ہزارہ کے اوجھل ستارے'' کے زیرِ عنوان لکھنا شروع کیا جو سہ ماہی ''شعر و سخن'' مانسہرہ میں چند اقساط میں شائع ہوا۔ ان مضامین میں انھوں نے مختصراً شعروادب کی شخصیات کے احوال لکھے ہیں۔ جو ہزارہ کے ادبی منظرنامے پر طلوع ہوئیں اور یہاں اپنے علم و ہنر کے کرشمے دکھانے کے بعد زندگی کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئیں چاہے یہ اہلِ ادب مستقلاً کہیں اور جا بسے یا گوشہ نشین ہو گئے۔ ان میں بہت زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو بسلسلۂ ملازمت ہزارہ میں مقیم ہوتے رہے اور یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا حصہ رہے۔

اس حوالے سے جن احباب کا تذکرہ ہوا ہے ان میں فضل حسین صمیم، عبداللہ صاحب، میجر غضنفر عباس قیصر فاروقی، عذرا کنول، غضنفر مہدی، پروفیسر قاضی جمیل الرحمٰن، قاری محمد قاسم مسلم، قمر بخاری، محمد علی تنہا، پروفیسر سید مبارک اکمل گیلانی، مسرت کنول، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، منظور سہیل، ناصر اسلم ایڈووکیٹ، یونس نشاط، سعید احمد اختر، سید جاوید، قاضی سیف الرحمٰن سیف، ڈاکٹر سید قاسم محمود، شازیہ طارق پنہاں، شاعر ہزاروی، عبدالرشید ہزاروی، ظہیر زیدی، عارف بٹالوی، عبدالواحد خاموش، عبدالغفور مصور، حافظ عبدالقیوم بیتاب، عبداللہ یزدانی، پروفیسر احسن علی خان، ارشد جدون، قاضی اسحاق عاصم، افضل خان سواتی، سید اقبال حسین شاہ مخلص، اقبال کاوش، اکرام جمالی، پروفیسر اورنگزیب، ڈاکٹر ایوب صابر، پروین سیف، توقیر فراغ، ثریا فرمان، جاوید قریشی، جاوید گل، حاکم علی حاکم، ڈاکٹر حسنین رضا، حنیف دیپ، خالد خواجہ، خاور احمد، ریاض ساغر، مجید داتوی، محبوب جوش، محمد اکرم ہزاروی، ڈاکٹر محمد رفیق، میکھی میر تھی، ناظر نقوی، نثار ترین جاذب، مرزا انور بیگ برلاس، مرزا شاہد کیانی، ملک سعید اختر، مقرب آفندی، میر ولی اللہ، نثار ہاشمی، نسیم سیٹھ، نشتر رامپوری، نظیر انبالوی، نیاز سواتی، یٰسین سکندر، اختر جنجوعہ، اسرائیل مجبور، اسلم ناز خواجگانی، بشیر احمد خوشنود، خلیل شاہد، حفیظ اثر، حفیظ ضیغم، راجا ایف ڈی محمود، سلیم شوق، سیف ہزاروی، شبیر نیازی، شیراز کیانی، ڈاکٹر صابر کلوروی، پروفیسر صغیر احمد سبحان، عبدالغفور ملک اور عبدالقیوم شفق ہزاروی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

گو کہ ان میں بعض احباب کے حالات نہایت مختصر ہیں لیکن اس کے باوجود سلطان سکون نے ان شخصیات کا بہت خوبصورت انداز میں تذکرہ کیا ہے۔ جن سے آج کی نسل بالکل ہی ناواقف ہے۔ ان مضامین میں تذکرہ نگاری کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں اور یہ اُردو کے قدیم تذکروں کی یاد دلاتے ہیں۔ جن اہلِ ادب کا ذکر کیا گیا ہے ان سے ہزارہ میں علم و ادب کی ایک روایت موسوم ہے۔ سلطان سکون کی یادداشتوں کو اہلِ ادب کی بڑی تعداد نے پسند کیا اور اپنے خطوط میں اس کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ مدیر شعرو سخن کے نام اپنے ایک خط میں جناب صوفی عبدالرشید نے سلطان سکون کی یادنگاری کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

> ”حضرت سلطان سکون کی یادنگاری نے بہت کچھ یاد دلا دیا۔ جن ادبی شخصیات کا ان کی تحریر میں ذکر ہوا ہے اپنے کارنامۂ فن اور شخصی محاسن کے باعث وہ بجا طور پر استحقاق رکھتی ہیں کہ ارباب ذوق کی محفلوں اور ادبی تذکرہ و تاریخ میں ان کی یاد تازہ رکھی جائے۔ سلطان صاحب نے ایک طویل روایت کے بکھرے

ہوئے سلسلے کی کڑیاں جوڑنے کی سعی کی ہے۔وہ تلاش کے اس عمل میں کامیاب رہے ہیں۔ یہ تحریریں ہزارہ میں اُردو شعر کے ارتقا پر کام کرنے والے اصحاب کے لیے دلیلِ راہ ثابت ہوں گی"۔(۲)

صوفی رشید اور ان جیسے اصحابِ علم کی جانب سے پذیرائی کے باوجود کچھ لوگوں نے ان تحریروں پر بے جا تنقید کر کے سلطان سکون کو رنجیدہ خاطر کیا اور یوں محض چند اقساط کے بعد ہی یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اعتراض کرنے والوں نے ایک نقطہ یہ بھی اٹھایا کہ یہ کوئی مستند تحقیق نہیں ہے اور بعض لوگوں کے کوائف میں کمی بیشی کی گئی ہے۔ حالانکہ سلطان سکون نے نہایت خلوص سے اپنی یادداشت کے زور پر یہ تحریریں سپردِ قلم کی ہیں اور اپنے ابتدائی مضمون میں ہی یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ "زیرِ نظر تحریر نہ تو کوئی باقاعدہ ادبی مضمون ہے اور نہ ہی ادبی تاریخ ہے"۔(۳)

یہ حقیقت ہے کہ یہ تحریر ادبی تحقیق و تاریخ نویسی کے مروجہ اصولوں کی روشنی میں نہیں لکھی گئی بلکہ محض سلطان سکون کے حافظہ کا حاصل تھی یا ان کے پاس دستیاب مواد سے ترتیب دی گئی تھی۔ اس سب کے باوجود ان یادداشتوں سے ہزارہ میں ادب کی صورتِ حال کے بہت سارے نقوش ابھرتے ہیں۔ جو مزید تحقیق و جستجو پر اکساتے ہیں۔ یوں ان کی اہمیت سے کسی طرح انکار ممکن نہیں۔ ان تحریروں کے علاوہ سلطان سکون نے مختلف مواقع پر علمی و ادبی اور شخصی مضامین بھی قلمبند کیے ہیں جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ مضامین سلطان سکون کی نثر کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

شخصی مضامین:

احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں سلطان سکون ان جذبات کا اظہار کرتے ہیں:

"قاسمی صاحب مدت مدید سے ہماری اور اس دور کی نسلوں کی نہ صرف ادبی بلکہ اخلاقی اور معاشرتی تربیت کرتے چلے آرہے تھے اور یہ بات ہر شخص کے اپنے اپنے ظرف و شعور پر منحصر رہی ہے کہ اس نے قاسمی صاحب کی تربیت سے کیا اور کتنا کچھ حاصل کیا"۔(۴)

سلطان سکون کو احمد ندیم قاسمی سے بہت عقیدت تھی۔ احمد ندیم قاسمی بھی انھیں بہت عزیز رکھتے

تھے۔ احمد ندیم قاسمی کی طرح کچھ اور احباب کے حوالے سے بھی سلطان سکون نے عمدہ مضامین تحریر کیے ہیں جو ان کی اپنے احباب سے محبت وعقیدت کے مظہر ہیں۔ ان میں مفتی محمد ادریس مرحوم اور حاجی گل بخشالوی کے حوالے سے لکھے گئے تاثراتی مضامین بھی سادہ وسلیس نثر میں بہترین اظہاریے ہیں۔ سلطان سکون نے جس طرح احباب ومشاہیر کے لیے خوبصورت نظمیں تخلیق کی ہیں اسی طرح نثر میں بھی انھیں عمدہ خراج تحسین پیش کیا ہے۔

پیش لفظ، دیباچے، فلیپ:

کتابوں پر پیش لفظ، دیباچے، فلیپ یا تقریظیں لکھنے کا چلن اب عام ہو چکا ہے اور نو آموز شعرا و ادیب مستند اہل قلم کی آراء سے اپنی تصانیف وتالیفات وقیع بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سلطان سکون نے بھی کئی کتابوں پر اپنی آرا درج کی ہیں جن میں سے چند اہم کتب درج ذیل ہیں:

۱۔ حدیثِ دوست۔ صوفی عبدالرشید کے شعری مجموعے "سخن سرمست" پر۔ ۲۰۰۳ء

۲۔ اک ہمدمِ دیرینہ۔ آصف ثاقب۔ "در کنار"۔ ۲۰۰۸ء

۳۔ پسِ ورق۔ سعداللہ سورج۔ "سورج کی پہلی کرن"۔ ۲۰۰۸ء

۴۔ وحید بسمل کی ڈرامہ نگاری اور ہندکو ادب۔ وحید بسمل۔ ہندکو ڈرامے "کھیڈ اں"۔ ۲۰۱۱ء

۵۔ فلیپ۔ "قوس قزح" از رفعیہ خورشید ترک"۔ ۲۰۱۳ء

۶۔ شاہ نواز سواتی کی شاعری اور شخصیت۔ "ہم تو چپ تھے"۔ شاہ نواز سواتی۔ ۲۰۱۵ء

۷۔ دامنِ کہسار کا شاعر۔ "بڑی دیر کے بعد"۔ سعید ناز۔ ۲۰۱۸ء

۸۔ فلیپ۔ "اکتفا"۔ آصف ثاقب۔ ۲۰۱۸ء

ان کتب کے علاوہ سلطان سکون نے خود اپنی تمام کتابوں پر پیش لفظ اور دیباچے وغیرہ لکھے ہیں جن میں ان کی خوبصورت نثر کے کمالات سامنے آتے ہیں۔ اس کے علاوہ سلطان سکون کی نثر ان کے ہزاروں کی تعداد میں لکھے گئے خطوط میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔

خطوط نگاری:

خطوط نگاری کا فن نہایت قدیم ہے۔ اس کی قدامت کا اندازہ ہمیں حضرت سلیمانؑ کے ملکہ سبا کو

لکھے گئے خط سے ہوتا ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں کیا گیا ہے۔ اسلام کے آغاز میں دنیا کے بادشاہوں کو دین کی دعوت دینے کے لیے بھی نبی کریمؐ نے خطوط لکھے۔ یوں خطوط نگاری کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں اس فن کے نمونے موجود ہیں۔

خط کو نصف ملاقات کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرف رابطے کی ایک صورت یا ذریعہ رہا ہے۔ تو دوسری طرف خط لکھنے والی شخصیت کا آئینہ دار بھی ہوتا ہے۔ خطوط نگاری کے حوالے سے ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

"خط تہذیب انسانی کے محیر العقول عجائبات میں سے ایک ہے۔ انسان کی یہ اختراع زندگی کے عجیب وغریب اور ہمہ گیر تقاضوں سے پیدا ہوتی ہے۔ پہلے محض سادہ ضرورتوں کو پورا کرنے کی حد تک محدود رہی۔ اس کے بعد جملہ فنونِ عالیہ کی طرح ایک فنِ لطیف بلکہ بقول بعض لطیف ترین فن بن گئی"۔(۵)

بلاشبہ خطوط نگاری ایک ایسا فن ہے جس کا ذخیرہ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں موجود ہے۔ اُردو میں خطوط نگاری کو بامِ عروج تک پہنچانے کا سہرا مرزا غالب کے سر ہے کہ انھوں نے اس فن کے ذریعے اردو میں نثر نگاری کو ثروت مند کیا۔ اور پھر بعد میں آنے والوں نے غالب کے خطوط کو اُردو نثر کا معیار قرار دیا۔ اُردو کا شاید ہی کوئی قاری ہوگا جو خطوط غالب کے سحر سے بچ سکا ہو۔ غالب نے خطوط کو مکالے کی صورت دے دی جس سے اس فن میں جدت پیدا ہوئی اور خطوط غالب کو آج بھی اُردو نثر میں ایک مرقع کی حیثیت حاصل ہے۔

غالب کے علاوہ علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد کے علاوہ کئی دوسرے اکابرینِ ادب کے خطوط بھی اُردو کے نثری سرمائے کی حیثیت سے محفوظ ہیں۔ سلطان سکون نے اُردو شاعری اور ہندکو ادب کی جمع آوری کے ساتھ ساتھ ہزاروں کی تعداد میں خطوط لکھے ہیں۔ ان کے ادبی ذخیرے میں مشاہیر و معاصرین کے بھی ہزاروں خطوط ہیں جو جواباً انھیں موصول ہوئے۔

سلطان سکون کے خطوط ان کی نثر کے عمدہ نمونے ہونے کے ساتھ ساتھ بعض انفرادی خصوصیات کے حامل بھی ہیں جن کا تذکرہ قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

سلطان سکون کی سب سے بڑی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے ہر خط کی پیشانی پر" پاکستان سلامت رہے" کے الفاظ درج کرتے ہیں۔ جو اُن کی وطن سے بے پایاں محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

کچھ عرصہ پہلے تک آپ ایک اور نہایت دلچسپ اور انفرادیت کا حامل کام یہ کرتے تھے کہ خط کے اوپر مکتوب الیہ کی تصویر بھی چسپاں کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک خط کے جواب میں احمد فراز نے آپ کو

نہایت خوبصورت جوب ارسال کیا۔ احمد فراز لکھتے ہیں:

''آپ کا محبت نامہ ملا۔ لفافے پر اپنی تصویر دیکھ کر مجھے ہی نشاط آ گیں حیرت نہیں ہوئی بلکہ غالباً نامہ بر کو بھی اچنبھا ہوا ہوگا کہ یہ نیا ٹکٹ کب سے اجرا ہوا''۔(۶)

اسی خط میں احمد فراز نے سلطان سکون کے لیے یہ خوبصورت شعر بھی لکھا ہے:

برائے نام بھی ہم کو سکون کیا ہو جہاں
سکون نام کا اک شخص اضطراب میں ہے

سلطان سکون کے زیادہ تر خطوط ایسی ہی دلچسپیوں کے حامل ہیں۔ گو کہ ان کے خطوط زیادہ تر نجی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والی تخلیقات پر اظہار رائے کے لیے بھی خطوط ہی کا سہارا لیتے ہیں۔ یوں ان کے خطوط ملک کے مؤقر علمی و ادبی رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ تاہم احباب کو لکھے گئے ان کے خطوط کی سب سے بڑی خوبی ان کا اخلاص ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ خط کے ذریعے رابطے کو آسودگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ چاہے ان کے خطوط نجی حالات پر مشتمل ہوں یا علمی و ادبی احوال پر ان میں ایک شگفتگی پائی جاتی ہے۔ نجی حالات کا تذکرہ کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ بعض دفعہ ان کا مکمل کوائف نامہ مرتب ہو سکتا ہے۔ مظفر آباد آزاد کشمیر کے ڈاکٹر غازی علم الدین کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ میرے جد امجد کا تعلق مظفر آباد سے تھا جو اٹھارہویں صدی کے اواخر میں سکھ ڈوگروں کے بہیمانہ ظلم و ستم سے تنگ آ کر ایبٹ آباد کے نواح میں علاقہ تناول میں ہجرت کر کے آباد ہو گئے''۔(۷)

سلطان سکون کے خطوط زیادہ تر اسی نوعیت کے ہوتے ہیں جن میں سادہ اور سلیس نثر میں مختلف موضوعات پر بات ہوتی ہے۔ ان میں عام بات چیت، تعزیت نامے، کتب و رسائل کی رسیدیں، تعریفیں، حوصلہ افزائی سے لے کر کتابوں پر تبصرے، اشعار پر گرفت یا توصیفی کلمات، غرض ہمہ جہت موضوعات کا احاطہ ہوتا ہے۔ ان کے خطوط پاکستان بھر کے اہل علم و ادب کے نام لکھے گئے ہیں جو خطوط کے مختلف مجموعوں کی زینت بن رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے غازی علم الدین کے نام خطوط کے مجموعے میں سلطان سکون کے خطوط شامل کیے گئے۔ حال ہی میں ڈاکٹر شاہد اشرف نے احمد ندیم قاسمی کے خطوط کا مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں سلطان سکون کے گیارہ خطوط شامل ہیں۔ انھی میں سے ایک خط

میں احمد ندیم قاسمی نے اپنی معروف غزل بھی لکھی ہے، جس کا مطلع ہے(۸):

جب تیرا حکم ملا ترک محبت کر دی
دل مگر اس پہ وہ دھڑکا کہ قیامت کر دی

سلطان سکون نے ملک بھر کے اہلِ علم وادب سے خطوط ہی کے ذریعے رابطہ قائم رکھا ہے۔ اہلِ علم کے پاس ان کے ہزاروں خطوط جمع ہیں۔ وہ اب بھی خط کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک روایت پسند انسان ہیں اور اپنی روایات سے محبت کرتے ہیں۔ اب جدید ذرائع ابلاغ کے آنے سے خطوط نگاری کا فن سلطان سکون جیسے بزرگوں تک ہی محدود ہے۔ گزشتہ دنوں بزرگ شاعر وادیب جمیل یوسف کے نام اہلِ ادب کے خطوط کا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں بھی سلطان سکون کے کئی خطوط شامل ہیں۔ جن میں مختلف موضوعات پر اظہارِ رائے کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں ثقہ اہلِ قلم کے خطوط شامل ہیں جن میں سید ضمیر جعفری، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، حکیم محمد سعید، مختار مسعود، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، مشفق خواجہ، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر معز الدین احمد، محمد سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، اقبال فیروز، محسن جمیل اور محمد اقبال اختر کے نام شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل سلطان سکون کے خطوط کس نوعیت کے ہیں اس کی ایک جھلک اس اقتباس میں دیکھی جا سکتی ہے:

"آپ کا ارسال کردہ تحفہ کلام مصحفی موصول ہوا۔ شکریہ کے علاوہ اور کوئی لفظ بنا ہی نہیں جو لکھتا۔ آپ تو ماشاءاللہ ہمہ وقت کسی نہ کسی ادبی کام میں مصروف رہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر خیال آیا کہ آپ عدم کے حوالے سے بھی ایسا ہی کوئی انتخاب مرتب کریں تو کیا ہی اچھا ہو۔ عدم میرے بھی بہت پسندیدہ شاعر ہیں۔ کاش مجھے بھی نثر میں لکھنے کا تجربہ وسلیقہ ہوتا تو میں خود عدم کا انتخاب کرتا۔ اگرچہ عدم کے میرے پاس ۳۵ مجموعہ ہائے کلام موجود ہیں"۔(۹)

سلطان سکون کے خطوط اس حوالے سے بھی اہمیت کے حامل ہیں کہ ان میں، ان کی ذاتی زندگی، پسند ناپسند، خواہشات، مسائل حال، ان کے معمولات اور ان کی محبتیں اور عقیدتیں اس انداز سے بکھری پڑی ہیں کہ ان کے مطالعے سے اُن کی ایک ضخیم سوانح عمری مرتب کی جا سکتی ہے جو اُردو کے سوانحی ادب میں بلاشبہ ایک خوبصورت اضافہ ہوگی۔

حوالہ جات

۱۔ سلطان سکون، مکتوب بنام غازی علم الدین، مشمولہ: ''اہلِ قلم کے مکاتیب بنام غازی علم الدین''، مرتبہ ڈاکٹر آصف حمید، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ستمبر ۲۰۱۶ء، ص ۳۱۵

۲۔ صوفی عبدالرشید، مراسلہ، مشمولہ: سہ ماہی ''شعر و سخن''، مانسہرہ، جولائی تا ستمبر ۲۰۱۰ء، ص ۸۳

۳۔ سلطان سکون، ''ہزارہ کے اوجھل ستارے''، مشمولہ: سہ ماہی ''شعر و سخن''، مانسہرہ، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۹ء، ص ۸۴

۴۔ سلطان سکون، ''جنات''، مشمولہ: سہ ماہی ''سوغات''، لاہور، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۸ء، ص ۳۹

۵۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''اردو خط نگاری''، مشمولہ: ''اردو مکتوب نگاری''، مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر سید اشفاق حسین بخاری، شائع زریں، اسلام آباد، نومبر ۲۰۱۵ء، ص: ۳۳

۶۔ احمد فراز، خط بنام سلطان سکون، مشمولہ: ''کچھ پھول عقیدت کے'' از سلطان سکون، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰۱

۷۔ سلطان سکون، خط بنام ڈاکٹر غازی علم الدین، مشمولہ: ''اہلِ قلم کے مکاتیب بنام غازی علم الدین''، ص ۳۱

۸۔ احمد ندیم قاسمی، مکتوب بنام سلطان سکون، مشمولہ: ''مکتوباتِ احمد ندیم قاسمی''، مرتبہ ڈاکٹر شاہد اشرف، مشتاق بک کارنر، لاہور، جون ۲۰۱۸ء، ص ۱۶۹

۹۔ سلطان سکون، مکتوب بنام جمیل یوسف، مشمولہ: ''خطوط بنام جمیل یوسف''، مرتب جمیل یوسف، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۴۷۳

ہندکو ادب کے لیے خدمات

الف: سلطان سکون کی ہندکو شاعری

سلطان سکون نے ملک گیر شہرت تو اپنی اردو شاعری کی وجہ سے حاصل کی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہندکو ادب کی طرف متوجہ ہوئے تو ہندکو اردو لغت، ہندکو ضرب الامثال و محاورات اور لوک ادب کی جمع آوری کے علاوہ ہندکو شاعری کے ذریعے بھی ناموری حاصل کی۔ انھوں نے ہندکو میں جن شعری اصناف کو ذریعۂ اظہار بنایا ان میں حمد، نعت، سلام، غزل، نظم، ماہیا وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

آپ کی ہندکو شاعری کا مجموعہ ''دلسو ٹھے'' کے نام سے ۲۰۰۸ء میں منصۂ شہود پر آیا اور ملک گیر شہرت حاصل کی۔ اس مجموعے کو اکادمی ادبیات کی طرف سے بہترین شعری مجموعے کا ایوارڈ حاصل ہوا۔

اس مجموعے میں حمد، نعت، سلام، نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔

حمد کے باب میں انھوں نے طویل حمد ''میریا اللہ'' لکھ کر خدائے بزرگ و برتر کی کبریائی بیان کی ہے۔ حمد کا ایک بند بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

تیری مرضی باجھ خدایا
کوئی پتر ہل نہیں ہکدا
کھڑ بیٹھ ہکدا نکل کوئی بھی
کوئی بوٹا نکل بیٹھ ہکدا
جس کسے آں توں نباہ چھوڑیں
او پھر اٹھ کے کھل بیٹھ ہکدا
تیری مرضی اگے اللہ
زور کسے دا چل بیٹھ ہکدا

حمد کے ہر شعر میں اللہ پاک کی بڑائی اور ہر ذرے میں اس کے وجود کا اعتراف کیا گیا ہے۔ حمد کا اختتام اس شعر پر ہوتا ہے:

حمد مکانا اتھے تیری
سب کچھ تیرا ہر شے تیری

حمد کی طرح سلطان سکون نے نعت میں بھی پر خلوص عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کو کفر پہ گزرنے والی قیامتوں اور ان کے لرزہ طاری ہونے کے تناظر میں کس سلیقے سے بیان کیا ہے:

جدوں عرب دا سوہنا چن چڑھیا ہر پاسے نور ظہور ہویا
جدوں عرب دے باغ دا پھل کھلیا خوشبو نال جگ ہر پھور ہویا
گی کچی حویلی شرکاں دی ہلے بام چبارے باطل دے
چڑھے پرچم پیار اجالے دے ہر ظلم انھیرا دور ہویا

حضور ﷺ سے انھوں نے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ آپ کی ذات سے دنیا میں جو اجالا ہوا جو نور پھیلا اس کی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔

سلام کے ذریعے سلطان سکون نے حضرت امام حسینؓ کی عظیم قربانی بڑے بھرپور انداز میں اور بڑے قرینے سے خراج تحسین پیش کیا ہے:

کٹا کے سر اوہ اڑاں حق دی خاطر
اساڈے سر تے شملہ ٹنگ گیا اے
دیے او بال کے اپنے لہو دے
چواں کنڈاں تے لویاں کر گیا اے

دین کی سربلندی اور بقا کے لیے اپنے لہو سے جو قربانی حضرت امام حسینؓ نے پیش کی اسی کی وجہ سے ہم تک دین کی روشنی پہنچی اور یہ قربانی رہتی دنیا تک حق و باطل کے درمیان فرق کا معیار قرار پائی۔ اس کا بڑا خوبصورت نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ سلطان سکون نے ہندکو نظم کو بھی ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ انھوں نے جس طرح اپنی اردو نظم میں عقیدت و محبت کے پھول کھلائے ہیں۔ اسی وصف سے ان کی ہندکو نظم بھی جگمگا اٹھی ہے۔ حضرت قائداعظم اور پاکستان دا گیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ہندکو نظم نگاری میں بھی ان کے مخصوص اسلوب اور سادگی کی جھلک واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔

ان کی نظموں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بڑے موثر انداز میں پرویا گیا ہے۔ جس کی عمدہ مثال ان کی نظم "رات" ہے۔ جس کو آصف ثاقب نے "ہندکو شاعری کی سرتاج" (۱) قرار دیا ہے۔

نظم "رات"

کھلی نلی جنڈڑی، کوئی بھی نیئہہ دردی
کوڑے سارے ناتے، لے جگراتے
سارا جگ غرضی، اللہ تری مرضی
سچی تیری ذات اے
کالی شاہ رات اے
دیا پیا بُجھدا کچھ بھی نیئہہ سُجھدا
تیل پیا مُکدا ساہ پیا سُکدا
باقی بچی سڑدی تڑ تڑ کردی
کالی شاہ رات اے
ولا اُتے زور کیتا فکراں خیالاں
سکی سڑی باتی آں چیک چیک بالاں
بوہے دیاں جِھیتھاں بچ اُٹھ اُٹھ بیالاں
اللہ جانے اج ہوئی بکوھے ویلے نو
کالی شاہ رات اے

پوری نظم اپنے اندر کربِ تنہائی لیے ہوئے ہے اس سے درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ نظم سلطان سکون کی نمائندہ نظموں میں سے ایک ہے۔ ۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو آنے والے زلزلے کے حوالے سے ان کی نظم "بھیم" (زلزلہ) حالات و واقعات کی اتنی خوبصورت تصویر کشی کا مرقع ہے کہ تمام واقعات آنکھوں کے سامنے رونما ہوتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ انھوں نے شہروں کی تباہی کا ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ قاری کا دل ڈوب ڈوب جاتا ہے۔

اسی طرح ان کی نظم "دھیاں نماڑئیاں" ہمارے بہت سارے معاشرتی رویوں پر بے لاگ تبصرہ ہے۔ ہمارے معاشرے میں بیٹیوں سے ہونے والے سلوک اور ان کے مشرقی کردار کو بڑے دلنشین

انداز میں اجاگر کیا گیا ہے۔

ماں سے محبت کا اظہار ان کی اردو شاعری کا بھی ایک خاص موضوع رہا ہے اور انھوں نے اپنی ہندکو شاعری میں بھی "دو ماواں" اور "ماں" جیسی خوبصورت تاثراتی نظموں سے ہندکو شاعری کو ثروت مند کیا ہے۔

"دو ماواں" فقط سلطان سکون کے دلی جذبات کا اظہار نہیں بلکہ ہر اس شخص کے دل کی آواز ہے جو اپنی دھرتی کی عزت کو سب چیزوں سے مقدم سمجھتا ہے۔ ایک بند بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

اِک ما اوہ اے جو مِی جنڑدی اے
اِک ما ایہہ وطن دی تھرتی اے
دوئے ماواں ساڈیاں ماواں نے
دوئے ماواں ٹھنڈیاں چھاواں نے
اُسی انھدی چھاواں بہندے آں
دُکھ سہہ کے بھی خوش رہندے آں

یعنی اپنی دھرتی امن و سکون کا وہ سائبان ہے جہاں ہم دُکھوں کے باوجود خوشی سے رہتے ہیں۔ یہی انداز انھوں نے نظم "ماں" میں بھی اپنایا ہے۔

ماں سے عقیدت و محبت کے رشتے کا اظہار اور ماں کے غیر مشروط پیار کو نہایت ہی دردمندانہ انداز میں نظم کے اشعار میں پرویا ہے:

میں جتنڑ بھی ماں جوگے بچہ واں
میں اس جوگے عقل دا کچا واں
میں کوڑا سارے جگ کولوں
پر اُس جوگے سب کولوں سچاواں

بلاشبہ یہ ہر انسان کی کہانی ہے۔ اولاد بڑھاپے کو بھی پہنچ جائے تو ماں کے دل میں اس کے لیے ایسے ہی جذبات موجزن رہتے ہیں۔ سلطان سکون نے اس موضوع کو بڑے قرینے سے نظم کا موضوع بنایا ہے۔

نظم کے کامیاب نمونے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سلطان سکون نے اپنی ہندکو غزل کے ذریعے خوب شہرت اور ناموری حاصل کی ہے۔ ہندکو غزل کی روایت زیادہ قدیم نہیں ہے۔ بلکہ دیگر اصناف

کے مقابلے میں نسبتاً جدید صنف ہے۔ مزاج اور ہیئت کے اعتبار سے یہ اردو غزل ہی کی طرح ہے۔ اردو غزل کے سارے لوازمات ہندکو غزل میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ جن کو ڈاکٹر ممتاز منگلوری یوں اجاگر کرتے ہیں:

"ہندکو غزل کی ہیئت، تکنیک اور مزاج وہی ہے جو اردو غزل کا ہے اردو غزل میں جو جدتیں پیدا ہوتی رہیں۔ ہندکو شاعر بھی ہندکو غزل کو نئے لہجے، نئے تجربات سے ہم آہنگ کرتے رہے۔ دراصل ہندکو شاعری کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرنے والے شاعر عام طور پر اردو میں بھی شاعری کرتے رہے۔ اس لیے اردو اور ہندکو کی غزل میں بھی بُعد پیدا نہیں ہوا۔" (۲)

سلطان سکون کا شمار ہزارہ کے اولین غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ہندکو غزل کی ابتدا ستر کی دہائی میں کی۔ اس وقت ہزارہ میں ہندکو غزل کی کوئی خاص روایت نہیں تھی۔ سلطان سکون کی اردو غزل کا آغاز بھی پچاس کی دہائی میں ہوا لیکن ہندکو شاعری کی طرف وہ بعد میں متوجہ ہوئے۔ تاہم انھوں نے ہزارہ میں ہندکو غزل کی بنیاد رکھی۔ ان کی پہلی غزل ہفت روزہ "تشمین" ایبٹ آباد میں مدیر کے صدارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی:

"ہزارہ کی ہندکو زبان میں ماہیا، گیت، چار بیتہ، حرفیاں اور دیگر کئی ایک اصناف سخن تو ایک زمانے سے رائج اور مشہور ہیں لیکن غزل کا اس سے پہلے کہیں نشان نہیں ملتا۔ ذیل میں سلطان سکون کی ہندکو زبان کے مخصوص لہجے میں لکھی ہوئی وہ باقاعدہ غزل ہے جو ہری پور میں حالیہ "جشن ہزارہ" کے موقع پر ایک محفل مشاعرہ میں سنائی گئی۔" (۳)

سلطان سکون کی مذکورہ غزل نے بلاشبہ ہندکو غزل کی بنیاد رکھی اور ہزارہ میں اس کا احیا کیا۔ خوبصورت تشبیہات واستعارات سے مزین اس غزل کے دو اشعار نذر قارئین ہیں:

جدوں بُجھ کے توں مُدے تکھوں حال جلدیں
اگ بجھی ہوئی توں برے بال جلدیں
کدے ہسال جلدیں کدے روال جلدیں
چنگی ساڈے نال کھیڈ کھڈال جلدیں

محبت کے سچے اور سچے جذبات ،محبوب سے ہلکی پھلکی نوک جھونک اور گلہ شکوہ یہ غزل کے محبوب موضوعات ہیں۔ یہی عام طور پر سلطان سکون کے غزل کے بھی موضوعات ہیں تاہم سلطان سکون کا گہرا معاشرتی شعور، زندگی کی ابدی سچائیوں اور زندہ مسائل کو بڑی سہولت سے غزل کے اشعار میں پرونا ان کا کمال ہے۔

غزل کے دو اشعار ملاحظہ ہوں:

نیکاں لوکاں دی مجلس بچ
دور دلاں دا زنگ ہو جلدے

بخت نیھ مولدا پیھڑی گل دا
نل سپاں دا ڈنگ ہو جلدے

پہلے شعر میں انھوں نے ''صحبت صالح'' کو دلوں کے زنگ اتارنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ جبکہ دوسرا شعر اس ابدی سچائی پر مشتمل ہے کہ کسی کی تلخ اور ناروا بات کا زخم مندمل نہیں ہوتا حالانکہ سانپ کے کاٹے کا زخم ٹھیک ہو سکتا ہے یہ سلطان سکون کی غزل کا کمال ہے کہ وہ زندگی کے اہم موضوعات کو اپنے اشعار میں خوبصورتی سے پروتے ہیں اور اپنی زندگی کے تجربات سے ان کو کشید کرتے ہیں۔ ان کی غزل عام فہم اور سادہ اسلوب کی حامل ہونے کے باوجود تمام فنی لزوم سے بھرپور ہوتی ہے اور قاری کے لیے اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی ہے اور پڑھنے والے کو ہر سطح پر متاثر کرتی ہے۔ ان کی غزل کے اسی وصف پر پروفیسر بشیر احمد سوز یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''سلطان سکون نے جہاں زندگی کے حقائق پر گہری نظر رکھی ہے وہاں غزل کے رنگ و آہنگ کو نہیں بھولے وہ غزل کے مزاج سے بخوبی واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ غزل اردو زبان میں ہو یا ہندکو میں اپنے اندر گوناں گوں مضامین سمو لینے کے بعد بھی اصلی جوہر قائم رکھے ہوئے ہے۔ سلطان سکون کے ہاں غزل کے سارے رنگ ان سب عوامل سے مملو ہوتے ہیں۔'' (۴)

سلطان سکون نے اردو غزل کی طرح اپنی ہندکو غزل میں بھی عشق و محبت کے موضوع کو بڑی ہنرمندی سے برتا ہے۔ ان کی غزل اس حوالے سے سادگی اور پرکاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ حسن یار، سراپا محبوب، ادائے دلبری، ہجر و فراق جیسے مضامین کو بڑی حسن آفرینی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تیرے نال مینھ زلدا کوئی
سوہنڑیں ڈِھن پھِلے پھِلے
لوک تے سوہنے سوہنے ڈِٹھے
اس جیہاں نہ تھائیاں اکھیاں
پیار دا دیا بلدا ریہا
چھِکھرو چُھلے پنُھو سپوٹھے
دل لگنے تو باز نہ آیا
لکھ دلے آں ڈکدے ریہے

کِھلا اڈ کے تے سجناں کو دیخ آواں
اللہ اُسان کو بھی چڑیاں جیہے پردے

جدوں ہو گیا اکھیاں تو یار اوہلے
جنی کندھ تے جیہا قندھار اوہلے

پچھ کہین توں پچھن تاریاں کولوں
راتی سیت نینھ لائیاں اکھیاں

سلطان سکون نے غزل میں زبان وبیان سے بھی چاشنی پیدا کی ہے۔ انھوں نے ہندکو غزل میں محاورے کا استعمال بڑی مہارت سے کیا ہے اور یہ ہنر ان کی مسلسل کاوش وریاضت کا حاصل ہے۔ چند اشعار اس حوالے سے بطور نمونہ:

ساڈیاں اکھیاں اج بھی اوہ نئیں
اپڑیاں اُس بدلائیاں اکھیاں

توڑ چڑھن کے کم اساڈے
دانے بنے جندر ٹپلے

کتھے مکھن لسی، جتھے
ڈدھے دے رکھوالے بلے

وردی یار سکون مینھ ملدا
بکس نل بیٹھ کراں دلسوٹھے

اشعار میں ان محاورات کا خوبصورت استعمال جس سلیقے سے کیا گیا ہے وہ سلطان سکون کی زبان و بیان پر دسترس کی عکاسی کرتا ہے۔ سلطان سکون کی غزل متنوع موضوعات سے مملو دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں سماجی ناانصافیوں اور نارسائیوں پر واضح الفاظ میں مزاحمت کے عناصر دکھائی دیتے ہیں:

حق تنگھلا مینھ بل جلدا
اپڑوا حق تے کھسنا چینڈے
جد کوئی اگو راہ نہ دیوے
زورا زوری تھسنا چینڈے

سلطان سکون کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتے وہ مشکل حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے خیال میں کٹھن وقت بھی ہمیشہ کے لیے نہیں ہوتا بلکہ ان کی شاعری میں امید کی کرن نظر آتی ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

سدا مینھ رہندا اوکھا ویلا
یار نہ ٹباکیں دل دے ہوٹھے

لوک ڈوبڑیں دے تلے سکون کردن
سوہنا تارنے والا اساں تار دیندے

سلطان سکون کی شاعری میں ماں باپ سے محبت اور عقیدت اور ان کے احترام کا اظہار جا بجا ملتا

ہے۔والدین سے حسن سلوک ہماری تہذیب کی مضبوط علامت ہے اور اس کی تاکید مذہب نے بھی بھرپور انداز میں کی ہے۔ سلطان سکون کے نزدیک جس کے ماں باپ اس سے خوش ہوں۔ اس سے رب بھی راضی ہو جاتا ہے۔ یہ شعر اس کی بہترین عکاسی کرتا ہے:

جس تے ماپے راضی ہوون

اس تے رب دا رنگ ہو جلدے

اس موضوع پر سلطان سکون نے ایک مکمل غزل سپرد قرطاس کی ہے جس کے ذریعے والدین کی عظمت کو اجاگر کیا گیا ہے، چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

جڑھا ماؤ پیو دا خدمتگار ہوندے

بیڑا اُسدا تکے اتے پار ہوندے

کے پڑ بچ لگدی میٹھ کنڈ اُسدی

دُشمن اس دا آپ خوار ہوندے

ہوندے حج دے برابر ثواب اس دا

ماؤ پیو دا جدوں دیدار ہوندے

سلطان سکون کی غزل کے مضامین ہماری روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے جنم لیتے ہیں۔ روایات کی پاسداری، تہذیب و تمدن کا پرچار کرنا، والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا یہ ان کے محبوب موضوعات ہیں۔ اور ان کو بڑی ہنرمندی سے انھوں نے اپنی غزل میں پرویا ہے۔ سلطان سکون کی شاعری کے حوالے سے پروفیسر یحیٰی خالد یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"سلطان سکون شعر و سخن دی سلطنت دا سلطان بھی اے تے اس دی شاعری ساڈے جذبات تے احساسات دی سچی ترجمان بھی اے۔ سلطان سکون دیہات دی صاف ستھری فضا بچ اکھ کھولی اے تے اسی سادہ ماحول بچ بڈا ہوئے اس دی شاعری بچ اوہی سادگی تے سچائی پئی چھلکدی اے۔" (۵)

بحیثیت مجموعی سلطان سکون کی اردو غزل کی طرح ان کی ہندکو غزل بھی اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے اور ان کی سادگی و پُرکاری ہمارے مجموعی معاشرتی طرز احساس کی نمائندگی کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کو ہر سطح پر سراہا گیا ہے۔ ہندکو شاعری کی مشہور ترین اصناف میں سے ایک "ماہیا" بھی

ہے۔اور شاید عوامی مقبولیت کی اعتبار سے "ماہیا" سب سے زیادہ معروف صنف ہے۔ دو یا تین مصرعوں کی یہ مختصر صنف ہندکو کے علاوہ کئی دیگر زبانوں میں بھی رائج ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کا دامن کافی وسیع ہے اور بڑی آسانی سے اس میں متنوع موضوعات کو سمویا جاسکتا ہے۔ ہندکو زبان میں ماہیا کی وسعت اور مقبولیت کے حوالے سے ڈاکٹر ممتاز منگلوری یوں رقمطراز ہیں:

> "ہندکو لوک گیتوں کی مشہور اور اہم صنف "ماہیا" ہے۔ ماہیا کے لفظی معنی ہی محبوب کے ہیں اس صنف میں تغزل کی حقیقی روح نظر آتی ہے۔ وصل و فراق، راز و نیاز، جفا و وفا، رنج و خوشی، شک و بدگمانی کے گلے شکوے، بیم و یاس اور فکر و ذہن کی نفسیاتی کش مکش کے اجزاء کا اس صنف میں گہرے اور مکمل طور پر احاطہ کیا گیا ہے۔"(٦)

سلطان سکون نے بھی دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ ماہیا کو ذریعہ اظہار بنایا اور اس میں خوبصورت اضافے کیے ہیں۔ انھوں نے ماہیے کے قدیم ذخیرے سے مختلف موضوعات پر ماہیے کا ایک خوبصورت انتخاب اپنی کتاب "تارہ لوئی والا" میں جمع کیا اور اس میں خوبصورت اپنے تخلیق کردہ ماہیے بھی شامل کیے ہیں اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ہندکو شعری مجموعے "دلسوٹھے" میں بھی ماہیے شامل کیے ہیں۔ انھوں نے "تارہ لوئی والا" مختلف موضوعات پر ماہیے جمع کیے ہیں۔ جن میں حمد یہ نعتیہ ماہیے، وطن دے ماہیۓ، عمومی ماہیے سے لے کر ٹچکولی (مزاحیہ) ماہیے تک سب موضوعات شامل ہیں۔ سلطان سکون کے چند ماہیے بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

کہڑا گھوئے بچ تر خلدا
سجن جدا ہوون
بندہ جیندا ای مر خلدا

یہ ہجر و فراق کی بھرپور عکاسی کرتا ہے یہ وہ موضوع ہے جو دنیا کی ہر زبان کی شاعری میں اپنے اپنے انداز میں بیان ہوا ہے:

چنے رنگ دا کوٹ ہووے
توڑ مینہ چڑھدی اے
کدے والاں بچ کھوٹ ہووے

یعنی محبت میں اگر خلوص نہ ہو اور اس میں کسی قسم کی کھوٹ دکھاوا ہو تو محبت کبھی اپنے انجام کو نہیں پہنچ سکتی۔ تقدیر کے بارے میں یہ ماہیا دیکھیں:

لمی ندی کشمیر دی اے
طعنے نہ دیو لوکو
ساری گل تقدیر دی اے

سلطان سکون نے دیگر اصناف کی طرح ہندکو ماہیے کو بھی خوبصورتی سے آگے بڑھایا ہے اور اس میں خوبصورت اضافے کیے ہیں۔ انھوں نے بڑے رسیلے انداز میں ہندکو ماہیے کو فروغ دیا ہے۔ ان کی ہندکو شاعری میں ماہیا ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے۔ ان کی اس انفرادیت کو پروفیسر بشیر احمد سوز یوں اجاگر کرتے ہیں:

> "سلطان سکون ماہیے کے نہ صرف فن سے ہی آگاہ ہیں بلکہ انھیں ماہیے کی روح سے بھی گہری شناسائی ہے۔ انھوں نے ماہیے کی روایت کو اس کے اسلوب کے محاسن کے ساتھ آگے بڑھایا ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کے ماہیے ہمارے لوک ادب میں یقیناً قابلِ قدر اضافہ ہیں۔" (۷)

سلطان سکون ہندکو ادب میں ہمیشہ ایک منفرد مقام پر نظر آئیں گے انھوں نے نہ صرف ہندکو شاعری کی تمام اصناف کے فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا بلکہ ہزارہ میں اس کے بنیاد گزاروں میں شامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہندکو ادب کی جمع آوری اور اس کے قدیم ذخیرے سے "ہندکو اردو لغت" بھی ان کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے پہلے ہندکو زبان لغت سے محروم تھی اور ہندکو شعر و ادب میں یہ خوبصورت اضافے ان کی کئی برس کی محنت اور ریاضت کا حاصل ہیں۔

ب: سلطان سکون کی ہندکو اُردو لغت

زبان انسان کا وسیلہ اظہار ہے اور قدرت کی خاص عطا ہے اس کی بدولت انسان کو "حیوان ناطق" کا درجہ ملا زبان انسان کے درمیان رابطے کا وسیلہ ہے لہٰذا تہذیبی اور معاشرتی ارتقا زبان ہی کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ زبان کے وجود میں آنے سے پہلے لوگ اشاروں میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے تھے گویا یہ زبان ہی ہے جس کے وجود میں آنے کے بعد بکھری ہوئی ٹولیاں گروہ کی صورت زندگی کے دھارے

میں شامل ہوئیں گویا زبان ہماری معاشی اور معاشرتی ضرورتوں کی بنیاد ہے۔ زبان کی بقاء اور اس کے ارتقاء کے لیے ماہرین ہمہ وقت مصروف عمل رہتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان کئی قسم کے تغیر وتبدل سے گزرتی ہے۔ نئے نئے الفاظ کا شامل ہونا، کچھ الفاظ کا متروک ہونا، نئے علوم وفنون کو زبان کا حصہ بنانا یہ ماہرین کی مسلسل محنت کے نتیجے میں ہی ممکن ہوتا ہے۔ زبان کے ذخیرہ کو جمع کرنے کے لیے لغت نویسی کا عمل شروع ہوا جو الفاظ کی جمع آوری کے علاوہ اس کے استعمال اور بول چال کے حوالے سے رہنمائی کرتی ہے۔ زبان ہی کے ذریعے ایک نسل کا علمی وادبی سرمایہ دوسری نسل تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا لغت اس کی حفاظت کا فریضہ بھی ادا کرتا ہے۔ لغت کی اہمیت کو صوفی عبدالرشید ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''کوئی بھی زبان کسی معیاری لغت کے بغیر ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتی کہ الفاظ کا صحیح اور برمحل استعمال اور کسی تحریر کی درست تفہیم کے لیے لغت کی بہر حال ضرورت پڑتی ہے۔ لغت سے ہماری بے شمار علمی وادبی ضرورتیں وابستہ ہیں۔''(۸)

لغت کی اسی ضرورت اور اہمیت کے تحت لغت نویسی کا آغاز ہوا۔ بعض روایات کے مطابق اس کا آغاز چین سے ہوا تاہم ہندوستان میں اس کی ابتداء انگریزی عہد میں ہوئی جس کی تفصیل مسعود حسین یوں بیان کرتے ہیں:

> ''اردو لغت نویسی کی تاریخ کم وبیش ساڑھے تین سو سال کے عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ گریرسن کے مطابق اس کے پہلے لغت کی نشاندہی مسٹر کورج (Quaritch) کے مرتب کردہ کیٹلاگ (1887ء) سے ملتی ہے۔ جس میں 1630ء میں مرتب شدہ ایک فارسی، ہندوستانی، انگریزی، پرتگالی چار لسانی لغت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔۔۔۔ ہندوستانی عالموں میں اُردو لغت نویسی میں اولیت کا شرف عبدالواسع ہانسوی کو ہے جس نے اورنگزیب عالمگیر کے آخری دور میں طالب علموں کے لیے ایک مختصر سی لغت لکھی۔ ہانسوی کی اس قصباتی اور مدرسانہ کاوش کی جانب نظر بھی نہ جاتی اگر اس کے بعد مشہور عالم خان آرزو اس کی تصحیح کر کے نوادر الفاظ کے نام سے 1751ء میں مرتب نہ کرتے۔''(۹)

ہندوستان میں لغت اور قواعد زبان کے حوالوں سے انگریزوں نے بنیادی نوعیت کے کام کیے ہیں جس کی بنیاد پر بعد میں آنے والوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ انگریزوں نے اپنی ضروریات کے مطابق ذو لسانی لغات کی بنیاد رکھی اور جب لغت نویسی کا آغاز ہوا تو جن انگریزوں نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ان میں جان گلکرسٹ، ڈنکن فاربس، فیلن اور جان شیکسپئر کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں جبکہ جارج ابراہم گریرسن کو بعض محققین ہندوستان کا سب سے بڑا ماہر لسانیات شمار کرتے ہیں کہ اس نے Linguistic Survay of India جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی جس کا آغاز 1898ء میں ہوا اور 1928ء میں اس کی تکمیل ہوئی جس میں گریرسن نے ۱۷۹ زبانوں اور ۵۴۴ بولیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ ہندوستان میں رفتہ رفتہ اہل علم نے لغت نویسی کی طرف توجہ دینی شروع کی اور پھر ان کی مسلسل کاوش کے نتیجے میں کئی اہم ضخیم لغات سامنے آئیں جس میں سے سید احمد دہلوی کی "فرہنگ آصفیہ"، امیر مینائی کی "امیر اللغات" مولوی نورالحسن کی "نوراللغات"، مولوی فیروز الدین کی "فیروز اللغات" اور وارث سرہندی کی "علمی اردو لغت" نے خاص پذیرائی حاصل کی اور یہ آج تک اہل علم کی ضروریات پوری کررہی ہیں۔ یہ لغات ان کے مؤلفین کی ذاتی جستجو اور سعی مسلسل کا حاصل ہیں۔ تاہم ملکی سطح پر ایک مستند اور معیاری لغت کی تشکیل کی غرض سے ۱۹۵۸ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے ایک ترقی اردو بورڈ (موجودہ اُردو لغت بورڈ) قائم کیا گیا جس کا مقصد اوکسفرڈ ڈکشنری کی طرز پر اردو لغت مرتب کرنا تھا۔ اس نے کئی نامی گرامی ماہرین لسانیات کی مدد سے اس کام کو آگے بڑھایا۔ اور اب تک اس کی کل بائیس جلدیں مکمل ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔ یہ اردو کی مستند ترین لغت ہے۔ ماہرین لسانیات کی نگرانی میں لغت کے قواعد وضوابط کو مدنظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔ تاہم جن صاحبان علم نے انفرادی سطح پر یہ کارنامے سرانجام دیے ہیں۔ ان کے نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے کہ انھوں نے کٹھن سے کٹھن مراحل سے گزرتے ہوئے یہ معرکے سر کیے ہیں۔ اس دوران میں کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھانی پڑی ہیں۔ اس کی ایک جھلک "فرہنگ آصفیہ" کے مؤلف سے سنیے:

> "اگرچہ ابتداء سے انتہا تک رنج ومصائب کا ساتھ رہا مگر اس لخت جگر (لغت) کا سر اور اپنا ہاتھ رہا۔ بڑی بڑی موشگافیاں کیں تاریخی واقعات جدید وقدیم متعلقہ زبان کی تحقیقات سے نظیریں لیں۔ برسوں ایک ایک گلی اور کوچے کی خاک چھانی کہ اچھے اچھے کوچہ گردوں نے ہار مانی ملک درملک مارا مارا پھرا

جہاں مطلب دیکھا وہیں گرا۔'' (۱۰)

اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان تمام لغت نویسوں نے کس قدر مصائب جھیلے ہیں اور کئی کئی برسوں کی تگ ودو اور مسلسل ریاضت کے نتیجے میں کئی کئی جلدوں پر مشتمل لغات مرتب کی ہیں تاکہ آئندہ نسلیں ان سے استفادہ کرسکیں۔ لہذا ان کی یہ کاوشیں لائق صد تحسین ہیں کیوں کہ ان کی لغات پر ہی بعد میں آنے والوں نے انحصار کیا۔ اور زبان کے تمام ارتقائی مراحل سے لوگوں کو آگاہی ہوئی۔ کیوں کہ لغات محض الفاظ کے ذخیرے نہیں ہیں بلکہ بقول ڈاکٹر سلیم اختر وہ اس سے بڑھ کر بہت کچھ ہیں وہ لکھتے ہیں:

> ''عام تصور کے برعکس لغت الفاظ کا سٹور روم نہیں، نہ لفظوں کی کالونی اور نہ ہی الفاظ کی لشکر گاہ بلکہ یہ تو زبان کی ترقی اور نشوونما کے مختلف مراحل منعکس کرنے والا آئینہ ہے۔ جس طرح شہر کے لوگ کسی ملک کی تہذیب اور تمدن کے مظہر ہوتے ہیں بلحاظ زبان لغت بھی ایسی ہی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔۔۔ لغت کسی قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ تہذیبی ترقی کا مظہر بھی ثابت ہوتا ہے۔'' (۱۱)

اردو زبان کے ارتقاء کی تمام منزلوں کی آگاہی ان لغات کی بدولت ہو جاتی ہے۔ کہ ابتداء سے اب تک اس میں کون کون سے الفاظ ومحاورات شامل ہوتے رہے ہیں۔ اور کسی علاقے کا لہجہ دوسرے علاقے سے کس طرح مختلف تھا۔ نئی نئی ایجادات اور نئے علوم کی دریافت ان لغات کا کیسے حصہ بنتی رہیں یہ سب ہمیں ان لغات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔

اردو کے ساتھ ساتھ پاکستان میں کئی علاقائی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں جن میں پنجابی، سرائیکی، سندھی، بلوچی، پشتو، ہندکو، براہوی، اور شینا خاص طور پر قابل ذکر ہیں یہ زبانیں ادبی سرمائے سے مالا مال ہیں اور قدامت کے اعتبار سے بھی صدیوں کا سفر طے کر کے یہاں تک پہنچی ہیں۔ ہندکو زبان صوبہ خیبر پختونخواہ کے علاوہ پنجاب کے کئی علاقوں میں بولی جانے والی ایک قدیم زبان ہے جس کی قدامت کے بارے میں پروفیسر بشیر احمد سوز یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

> ''ہندکو زبان کے ابتدائی نشان 1500 قبل مسیح میں اس وقت ملتے ہیں۔ جب اس زمانے میں لکھت پڑھت کا آغاز ہوتا ہے پہلے پہل ''وید'' ضبط تحریر میں آئے ان ''ویدوں'' میں قدیم ہندکو کے الفاظ ملتے ہیں بعض کے خیال میں ان

ویدوں کی زبان بھی ہندکو تھی۔''(۱۲)

ہندکو زبان کو بولنے والے کشمیر کی وادی، جہلم، وادی کاغان، دیامر کی حدود، بابوسر سے دریائے سندھ کے مشرقی کنارے کے ساتھ، ضلع ایبٹ آباد، ہری پور، مانسہرہ، ٹیکسلا، حسن ابدال، ضلع اٹک سے کالا باغ تک موجود ہیں۔ جہلم سے تلہ گنگ اور چکوال تک، جبکہ پشاور، کوہاٹ، نوشہرہ، اکوڑہ خٹک اور ڈیرہ اسمٰعیل خان تک موجود ہیں۔ بلکہ مشہور ماہر لسانیات گریرسن نے اپنی شہرہ آفاق کتاب Linguistic Survay of India میں بہاولپور سے گزر کر سندھ کی سرحد تک ہندکو کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔

ہندکو زبان شاعری اور نثر کے اچھے خاصے ادبی سرمائے کی حامل ہے شعری اصناف میں ماہیا، لوک گیت، چاربیتہ، ٹپّے، قینچی اور لوری وغیرہ صدیوں سے رائج ہیں اور سینہ بہ سینہ چلتی ہم تک پہنچی ہیں اور بعد ازاں تحریری صورت میں محفوظ کی گئی ہیں نثر میں بھی اخلاقی کہانیاں، افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح، دینی ادب، تاریخی ولسانی تحقیق گویا ہر صنف میں طبع آزمائی کی گئی ہے جس کا سرمایا ہندکو زبان کا اثاثہ ہے تاہم کئی برسوں سے ہندکو زبان پر یہ اعتراض کیا جارہا تھا کہ ابھی اس کو زبان کا درجہ حاصل نہیں ہے کیوں کہ یہ ابھی تک لغت سے محروم ہے۔

لہٰذا اس کا ازالہ سلطان سکون نے کر دیا ہے۔ سلطان سکون نے اردو شاعری میں ملک گیر شہرت حاصل کی اور خصوصاً غزل میں انھوں نے خوب نام کمایا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں ہندکو کے ادبی سرمائے کو بھی اپنی محنت، لگن اور جستجو سے مالا مال کیا جس کا سب سے بڑا ثبوت پہلی ''ہندکو اردو لغت'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے جو کہ ان کی تین دہائیوں کی مسلسل محنت کا حاصل ہے۔ سلطان سکون اردو شعر و ادب سے ہندکو زبان کی طرف کیسے راغب ہوئے یہ قصہ ان ہی کی زبانی سنیئے:

> ''یہ کوئی کم و بیش پچیس برس پہلے کا واقعہ ہے کہ ایک روز اپنے ایک عزیز سے سرِ راہ ملاقات ہوگئی تو انھوں نے مجھ سے ایک خاندان اور اس کے افراد کے بارے میں حال احوال پوچھا گفتگو ہندکو زبان میں ہو رہی تھی جواباً میری زبان پہ بے ساختہ یہ جملہ آ گیا کہ ''او تے رل برل ہوگئے نے'' جس کے بعد مجھے مزید کسی تفصیل و وضاحت کی ضرورت نہیں پڑی کیوں کہ میرے مخاطب پر ہندکو کے اس مختصر جملے نے حال واضح کر دیا تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب مجھے اس امر کا

> شدت سے احساس ہوا کہ ہندکو زبان میں کیسی کیسی جامع اور بلیغ مطالب کی تراکیب اور کیسے کیسے خوبصورت الفاظ موجود ہیں جن کو ہم نے نظر انداز کر رکھا ہے چناں چہ اس کے بعد تخلیقی اور تحقیقی جوہر رفتہ رفتہ ہندکو زبان کی طرف منتقل ہو گیا۔"(۱۳)

یہاں سے سلطان سکون کا ہندکو زبان کے ساتھ ایسا تعلق پیدا ہوا کہ پھر پلٹ کر نہیں دیکھا اور ہندکو زبان کو اپنی تحقیق و جستجو سے مالا مال کیا۔ ہندکو اُردو لغت سے پہلے ان کی ہندکو کے حوالے سے ۴ کتابیں، بجھ میری بجھارت، اور چند چودھویں رات (بجھارتوں۔ پہیلیوں) پر مشتمل، کاری دی گل، ہندکو کی مختصر کہانیوں اور مختصر حکایات پر مشتمل کتاب کے علاوہ "ہندکو ضرب الامثال" شامل ہیں۔ ہندکو ضرب الامثال کا اختصاص ہے کہ یہ مقتدرہ قومی زبان سے شائع ہونے والی پہلی ہندکو کتاب تھی۔ سلطان سکون کی "پہلی ہندکو اردو لغت" ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئی لیکن اس سے پہلے یہ عنوان وار ہفت روزہ "جمہور" میں دسمبر ۱۹۸۱ء تا مارچ ۱۹۸۳ء شائع ہوتی رہی۔ "جمہور" کے مدیر غلام جان خان طاہر خیلی تھے جنھوں نے ہزارہ میں علم و ادب کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے اپنے ہفت روزہ میں، طرحی مشاعروں کا سلسلہ شروع کیا جس میں اس وقت کے نوجوان شعرا کا کلام اصلاح کے بعد شائع ہوتا رہا۔

ہفت روزہ "جمہور" میں ہی ہندکو زبان کی کہاوتیں اور ضرب الامثال مسلسل چار سال تک شائع ہوتے رہے۔

سلطان سکون کی اس مسلسل محنت اور تحقیق و جستجو کے نتیجے میں ہندکو زبان کو پہلی لغت نصیب ہوئی۔ تقریباً آٹھ ہزار ۸۰۰۰ الفاظ پر مشتمل یہ لغت گندھارا ہندکو بورڈ پشاور سے شائع ہوئی جس نے ہندکو زبان کے حوالے سے ایک دیرینہ اعتراض کا سدِ باب کیا سلطان سکون کے اس کارنامے پر انھیں بھرپور خراج تحسین پیش کیا گیا اور ان کا یہ کارنامہ انھیں ہندکو زبان و ادب کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رکھے گا کہ بقول پروفیسر بشیر احمد سوز:

> "اگر چہ سلطان سکون کی تحقیقی اور تخلیقی کاوشوں کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی جس کا ثبوت متعدد ایوارڈز اور میڈلز کی صورت میں موجود ہے لیکن موصوف کے جس کام نے ہندکو زبان و ادب میں انھیں ایک قد آور شخصیت بنا دیا وہ ان کا ہندکو اردو لغت ہے یہ ان کا ایسا کارنامہ ہے جس کی کسی سے سند

لینے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ہندکو زبان وادب میں ایسی کوئی مثال پہلے سے موجود نہیں اس اعتبار سے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ ہندکو اردو لغت وہ گہر آبدار ہے جو مدتوں تک سلطان سکون کے سر پر دستارِ فضیلت بن کر چمکتا رہے گا۔"(۱۴)

اس کارنامے پر بلاشبہ سلطان سکون ہر قسم کی دادو تحسین کے مستحق ہیں کہ انھوں نے کئی برس مسلسل تگ ودود کی، مشکلیں برداشت کیں، مواد کی جمع آوری کے دوران ان پر کڑے سے کڑے وقت بھی آئے لیکن ان کے پائے استقلال میں لرزش نہ آئی اور وہ اپنی دُھن میں لگے رہے اور آخر کار ۲۰۰۲ء میں ان کا یہ دیرینہ خواب مکمل ہوا۔

سلطان سکون نے ہندکو کے مختلف لہجوں کے الفاظ کو جمع کیا کیوں کہ زبان کا لہجہ ہر دس بارہ کلومیٹر کے بعد تبدیل ہو جاتا ہے اس طرح ایک ہی زبان کی قدرے مختلف صورت سامنے آتی ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے انھوں نے ہر لفظ کے ساتھ مختلف علامت دی ہے جس کے ذریعے اس مخصوص لہجے کی وضاحت ہوتی ہے یعنی یہ لفظ کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

(پ ش)۔ پشاور، (ا ت) اپر تناول

(ک غ) کاغان (ل۔ت) لوئر تناول

(گ ل) گلیات مری وغیرہ (ر ت) ریاستیں ملحقہ ہزارہ ڈویژن

(گ ج)۔ گوجری زبان (ہ۔ر) علاقہ ہری پور تا خانپور

اسی طرح ہندکو کے مترادفات جو دوسری زبانوں میں موجود ہیں ان کو حسب ذیل حروف سے ظاہر کیا گیا ہے۔

(انگ)۔ انگریزی، (ف) فارسی، (ع) عربی، (ہ) ہندی

کسی بھی ذولسانی لغت کا مرتب کرنا انتہائی دقت طلب کام ہے کیوں کہ ایسی صورت میں لغت نویس کا ہر دو زبانوں سے مکمل طور پر آگاہ ہونا نہایت ضروری ہے وگرنہ خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس حوالے سے مولوی عبدالحق یہ رائے دیتے ہیں:

"زبان کے لیے لغت کا ہونا جیسا کچھ ضروری ہے وہ محتاج بیان نہیں لیکن لغت لکھنا بڑا ٹیڑھا اور کٹھن کام ہے اور جہاں واسطہ دو زبانوں سے ہوتا ہے وہاں یہ

دشواری اور بڑھ جاتی ہے اور بڑا پتہ مارنا پڑتا ہے۔'' (۱۵)

اور اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ سلطان سکون بھی ان تمام کٹھن مراحل سے گزرے ہیں اور ان کے لیے مشکل اس سے سوا تھی کہ ان کے سامنے ہندکو لغت کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ ہندکو کی اولین لغت ہے یہ جن کٹھن مراحل سے گزر کر ہم تک پہنچی ہے اس کا مفصل احوال انھوں نے لغت کے آغاز میں رقم کیا ہے۔ اور ان کے معاصرین اور قریبی احباب اس تمام صورت حال سے آگاہ ہیں۔

سلطان سکون کے اس یادگار کارنامے پر اہلِ علم نے انھیں جس انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اس کی کچھ جھلکیاں قارئینِ ادب کے لیے یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ صوفی عبدالرشید لکھتے ہیں:

'' سکون صاحب کی اولیات میں زیرِ نظر '' ہندکو لغت '' وہ کارنامہ ہے جس سے یوں سمجھئے کہ جریدہ عالم پر ان کے کام اور نام کا دوام ثبت ہوگیا ہے۔ جب تک ہندکو زبان، اس کے بولنے والے موجود ہیں اس کتاب کی اہمیت اور افادیت محسوس کی جاتی رہے گی۔'' (۱۶)

شاعر ادیب اور اردو ادب کے استاد عامر سہیل نے ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

'' سلطان سکون نے ہندکو لغت نویسی کے باب میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اس کی اہمیت و افادیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مستقبل کے محققین ہی لگائیں گے لغت مرتب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کیوں کہ اس فن کی تدوین کے دوران پیش آنے والے مسائل بڑے بڑے اداروں کو پریشان کر دیتے ہیں لیکن سکون صاحب نے تن تنہا اور نہایت عرق ریزی کے بعد نہ صرف اصل ہندکو الفاظ کا کھوج لگایا بلکہ ان کے درست رسم الخط اور تلفظ کی نشاندہی بھی کی ہے۔'' (۱۷)

سلطان سکون کے اس کارنامے پر جہاں انھوں نے دادو تحسین سمیٹی وہیں اس پر کچھ اعتراضات بھی کیے گئے۔ جن کے انھوں نے لغت کی ابتداء میں بڑے تسلی بخش جوابات دیے ہیں۔ ایک عام اعتراض یہ تھا کہ لغت میں ضرب الامثال اور محاورات نہیں ہیں اس کی وجہ یہ کہ سلطان سکون نے ضرب الامثال اور محاورات کے حوالے سے ایک مکمل کتاب '' ہندکو ضرب الامثال '' مرتب کی۔ جو مقتدرہ قومی زبان سے شائع ہوئی۔

اسی طرح بعض الفاظ کے مطالب ومعانی پر بھی اعتراضات ہوئے اور رسم الخط کے اعتبار سے بھی ان سب اعتراضات کی انھوں نے بھرپور وضاحت بھی کی۔ تاہم انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہ ہندکو کی اولین لغت ہے۔ جس میں بہر حال کمی رہی ہوگی اور وہ اس کے ایک حتمی لغت ہونے کے دعویدار بھی نہیں ہیں۔ جس کا اعتراف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ یہ ہندکو زبان کی ایک مکمل لغت ہے کیوں کہ یہ ایک کلیات ہے اور اس میں کئی نوع کی خامیاں رہ گئی ہوں گی۔ بہت سے الفاظ شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے تاہم میں آپ کی طرف سے اس تحسین کا حقدار ٹھہرتا ہوں کہ میں نے عمر عزیز کا ایک تہائی حصہ صرف کر کے ہندکو زبان کو ایک بنیادی لغت فراہم کر دی ہے۔" (۱۸)

اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ یہ کارنامہ سلطان سکون نے اپنی ماں بولی سے محبت کے ثبوت کے طور پر انجام دیا ہے اور ان کا یہ کارنامہ ہر لحاظ سے ناقابل فراموش رہے گا۔ انھوں نے ہندکو زبان کی جھولی میں اپنی غزل، نظم، ماہیا، حکایات، کہانیوں اور محاورات وضرب الامثال کے پھول ڈالے ہیں لیکن ان کا اس زبان اور اہلِ زبان پر جو احسانِ عظیم ہے وہ بلا شبہ "ہندکو اردو لغت" ہے کہ انھوں نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی اس کی تکمیل کو یقینی بنایا اور آنے والوں کے لیے ایک راستہ بنایا ہے اور اپنی زبان کو "بولی" سے اٹھا کر زبان کے درجے پر فائز کرایا ہے جس کے لیے آئندہ نسلیں ان کی شرمندۂ احسان رہیں گی۔

حوالہ جات

۱۔ آصف ثاقب، دلسوٹھے، "مشمولہ: دلسوٹھے" از سلطان سکون، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱

۲۔ ممتاز منگلوری، مختصر تاریخ زبان و ادب۔ ہندکو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۲۹

۳۔ غلام ربانی، ملک، سلطان سکون دی ہندکو غزل: "مشمولہ ہفت روزہ، "شمسین" ایبٹ آباد، ۱۳ مئی ۱۹۷۹ء

۴۔ سوز، بشیر احمد، پروفیسر، ہزارہ میں ہندکو زبان و ادب کی تاریخ، ادبیات ہزارہ، ایبٹ آباد، ۲۰۰۸ء

۵۔ یحییٰ خالد، دلسوٹھے، "تقلیب" مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۸ء

۶۔ ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، مختصر تاریخ زبان و ادب۔ ہندکو، ص ۳۶

۷۔ سوز، بشیر احمد، پروفیسر، ہزارہ میں ہندکو زبان و ادب کی تاریخ، ادبیات ہزارہ، ایبٹ آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۹۱

۸۔ صوفی عبدالرشید، پروفیسر، جزیہ دار، "مشمولہ: ہندکو ضرب الامثال"، مرتب: سلطان سکونؔ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۲۔۳

۹۔ مسعود حسین، مقالاتِ مسعود، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، جنوری ۱۹۸۹ء، ص ۱۸۳

۱۰۔ دہلوی، سید احمد، مولوی، فرہنگ آصفیہ، جلد چہارم، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۵۲۵

۱۱۔ سلیم اختر، اردو زبان کیا ہے؟، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۷۲

۱۲۔ سوز، بشیر احمد، پروفیسر، ہزارہ میں ہندکو زبان ادب کی تاریخ، ادبیات ہزارہ، ایبٹ آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۹۳

۱۳۔ سلطان سکون، ہندکو اردو لغت، گندھارا ہندکو بورڈ، پشاور، ۲۰۰۲ء، ص ۱

۱۴۔ سوز، بشیر احمد، پروفیسر، ہزارہ میں ہندکو زبان ادب کی تاریخ، ادبیات ہزارہ، ایبٹ آباد، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۹۳

۱۵۔ مولوی عبدالحق، سٹینڈرڈ انگریزی اردو ڈکشنری، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص ۹

۱۶۔ صوفی عبدالرشید، ہندکو اردو لغت، "مشمولہ: ماہنامہ، اخبارِ اردو"، اسلام آباد، جولائی۔اگست ۲۰۰۳ء، ص ۲۳۶

۱۷۔ عامر سہیل، بابائے ہندکو، سلطان سکون، "مشمولہ: سہ ماہی شعر و سخن، مانسہرہ، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۲ء، ص ۱۸

۱۸۔ سلطان سکون، عرضِ حال، "مشمولہ: ہندکو اردو لغت، گندھارا ہندکو بورڈ، پشاور، ۲۰۰۲ء، ص vii

سلطان سکون: معاصرین ومشاہیر کی نظر میں

احمد ندیم قاسمی:

ہزارہ کی مردم خیز زمین سے جب مجھے سلطان سکون کی طرف سے "فنون" کے لیے غزلیں موصول ہونا شروع ہوئیں تو پہلی غزل سے ہی اندازہ لگالیا کہ اس شاعر کے لفظوں میں اجالا ہے اور اس کے شعروں میں روشنی ہے۔ پھر اتنے گہرے بے لوث خلوص اور اس پر مستزاد مزاج کی اتنی سادگی اور ایثار پیشگی مجھے بہت کم شعراء میں نظر آئی۔

قتیل شفائی:

آج ہزارہ کے گلستانِ شعروادب میں بہت رنگا رنگی نظر آرہی ہے جن میں ایک نمایاں رنگ سلطان سکون کا ہے جو دلکش تو ہے ہی اپنے جلو میں ایسی تخلیقی خوشبو بھی رکھتا ہے جو اپنی انفرادیت کی وجہ سے دور دور پہنچ رہی ہے اور جس سے پورے پاکستان کا مشام جاں معطر ہورہا ہے۔

محسن احسان:

سلطانوں کو سکون تو میسر نہیں لیکن سلطان ایسا شاعر ہے جس کی ذات کے اندر ہزار طوفان اٹھیں اور لاکھ آندھیاں چلیں وہ پرسکون دکھائی دیتا ہے اسی لیے اس کا کلام اس کی زندگی کا صحیفہ ہی نہیں اس کی ذات کا دلکش اور لطیف اظہار بھی ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہے جو کلاسیکی اور جدید غزل کی فنی ساخت کے رنگ وآہنگ کو نہ صرف معتبر رکھے ہوئے ہے بلکہ اس کی آبرو بڑھانے میں ایک عمر سے سرگرم ہے۔

شبنم رومانی:

سلطان سکون مجھے اس لیے بھی بہت عزیز ہے کہ وہ ابھی تک خود کو زندگی اور ادب کی اعلیٰ اقدار سے جوڑے ہوئے ہے وہ اس تہذیب کا دفاع کرتا نظر آتا ہے جو صدیوں کا سفر طے کر کے اس تک پہنچی ہے ۔۔۔۔ یوں سلطان سکونؔ ان معدودے چند شاعروں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہے جو محض زندگی کے لیے ادب نہیں لکھتے بلکہ ادب کو زندگی بنا لیتے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی:

سیدھے سادے اور صاف پیرایۂ بیان میں جذبات کا بھرپور اظہار سلطان سکون کی خصوصیت ہے۔ سکون کا ذہن و فکر، عصر حاضر کی نیرنگیوں اور سفاکیوں سے پوری طرح آشنا ہے وہ گرد و پیش کے حالات کا جائزہ بڑے متوازن لیکن کسی قدر غم آہنگ لہجے میں پیش کرتا ہے۔ اس کی غزلوں میں بچھڑنے اور کھوئے جانے کی کیفیت اکثر جگہ نمایاں ہے اس کیفیت نے اس کے اشعار میں سوز و اثر پیدا کیا ہے۔

پروفیسر صوفی عبدالرشید:

معصومیت، سادگی، بے ریائی اور اخلاص سکون صاحب کی شخصیت کے نمایاں عناصر ہیں ان ہی سے ان کی شاعری ترتیب پاتی ہے جیسی بے تصنع اور بے لوث شخصیت ویسی ہی شاعری بھی ہے جو بجا طور پر استحقاق رکھتی ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے اور یاد رکھا جائے۔

شیراز کیانی:

سلطان سکونؔ کی شاعری کے معصومانہ اور محرمانہ اسلوب کی کونپلیں بے ساختگی کی صورت پھوٹتی ہیں اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ سکونؔ کی ساری شاعری spontaneous overflowing of feelings پر مبنی ہے اور اگر تنہائی میں بیٹھ کر اسے پڑھنے کا موقع میسر آئے تو موصوف کی غزل کا ایک ایک مصرعہ زیر لب مسکراتا ہوا دل پر وار کرتا ہے۔

پروفیسر صادق زاہد:

سلطان سکونؔ کے فن کا خلوص اور انسانیت سے بھرپور محبت اس کی شاعری کی معراج ہے۔ لہٰذا سکون کی شاعری کا قاری بلا جھجک یہ کہہ سکتا ہے کہ سلطان سکون بحیثیت شاعر اور انسان زندگی کی اقدار اور اس کے مسلم اصولوں پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اس کی شاعری عام انسانی رویوں کی بھرپور عکاسی کرتی ہے اور آج کی اردو غزل کی یہ منفرد آواز ہے۔ جس کا اپنا رنگ اور اپنا آہنگ ہے۔

آصف ثاقب:

ان کی شاعری میں روحانی قدروں کی لپک جھپک کی من موہنی لے ہے۔ کوئی بھی سخن فہم شخص ان کے شاعرانہ سحر سے نہیں نکل سکتا۔ ان کی شعریت میں جہاں اور کئی رنگ ہیں وہاں میر کی سی دردمندی بھی چٹکیاں لیتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی شاعری اطراف و جوانب میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔

سلطان سکون کی نیک قدم اور خوش خبر تغزلانہ تحریک گرد و پیش میں یوں اثر انداز ہوئی ہے کہ ہر کوئی سکون سکون پکار اٹھا۔ ان کے موضوعات میں محبت کا چناؤ خوب سے خوب تر ہے۔ اس اختصاص کی گونا گونی سرافراز دکھائی دیتی ہے۔ غزل میں بہانے بہانے سے جمالیاتی اقدار کو بروئے کار لانا ان کا محبوب شیوہ سخن ہے۔ جذبہ و فکر کی بے ساختگی ان کا پسندیدہ طرزِ عمل ہے۔

جمیل یوسف:

سلطان سکون صرف اپنے انفرادی اور ذاتی غم کا اظہار نہیں کرتا بلکہ پورے معاشرے کے حوالے سے بات کرتا ہے اور پھر بات کہنے کا انداز کتنا سادہ مگر پُرکار ہے یہی سلطان سکون کا کمالِ فن ہے۔ اس کے اشعار بظاہر انتہائی سادہ اور بالکل سامنے کی بات لگتے ہیں۔ مگر اس کے ہاں الفاظ کا چناؤ ایسا ہے جس سے قاری کے ذہن میں دور تک معنی اور تاثر کی چوٹ پڑتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ اس کا شعر قاری کو گھیر لیتا ہے اور دیر تک اس کے شعری طلسم سے باہر نہیں آ سکتا۔

ڈاکٹر نذیر تبسم:

سلطان سکون ایک ایسا شاعر ہے جس کی شخصیت اس کی شاعری میں جھلکتی ہے اور جس کی شاعری اس کے خارجی و باطنی خدوخال کا احاطہ کرتی ہے۔ تضاد یا متضاد رویہ اس کی سرشت میں نہیں وہ ایک کھلی کتاب کی طرح ہے جس میں لکھا ہوا ہر لفظ گہرا بھی فکر انگیز بھی اور معنی سے بھرپور بھی ہے۔ اس کا تعلق معاشرے کے اس طبقے سے ہے جس نے نہ کبھی کھل کر سانس لی اور نہ ہی فکرِ معاش نے اسے چین کے لمحات میسر آنے دیے۔ قناعت اور درویشانہ اندازِ فکر نے اسے کبھی بھی منفی ردعمل پر نہیں ابھارا۔ اس کی شاعری میں گمبھیر فلسفیانہ انداز نہیں وہ ابہام کے پیرائے میں اپنی ذہنی کیفیتوں سے فرار بھی حاصل نہیں کرتا کسی پر مطالعہ کا رعب بھی نہیں ڈالتا، نہ ہی لفظوں کی بازیگری سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بس جو کچھ دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے۔ انتہائی سادگی اور دیانتداری سے کاغذ پر بکھیر دیتا ہے۔

پروفیسر محمد ارشاد:

سلطان سکون کا شمار ان شعرا میں با آسانی کیا جا سکتا ہے جو معروف بھی ہیں اور مقبول بھی۔ ان کی شاعری سادہ اور پرسوز ہے اور میرے گمان کے مطابق ان کی اپنی زندگی بھی سادہ اور پرسوز گزری ہے۔ گفت و کردار اور کردو گفت میں مطابقت بہت کم شاعروں کو نصیب رہی ہے۔ ان شاذ و نادر شعرا میں سلطان سکون بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر سفیان صفی:

سلطان سکون کی علمی اور ادبی خدمات کا اگر احاطہ کیا جائے تو ہندکو اور اُردو ادب کے حوالے سے آپ کی قابلِ تحسین سعی سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ہندکو زبان کے حوالے سے آپ کی لسانی خدمات جہاں ہندکو لغت کی صورت میں ہندکو کے الفاظ پریشاں کی شیرزاہ بندی کر رہی ہیں وہی ہندکو شاعری اور نثر بھی ہندکو ادب کی آبیاری کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ آپ نے جس ذوق شوق اور دلجمعی کے ساتھ اردو شاعری کے ارتقاء میں ہزارہ کی سرزمین سے اپنی وابستگی قائم رکھتے ہوئے خدمات انجام دی ہیں وہ اظہر من الشمس ہیں۔

ڈاکٹر اسماعیل گوہر:

سلطان سکون کا شمار بلاشبہ ان شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے غزل کی جدتوں کو راہ دیتے ہوئے خیال و جذبے کے اظہار میں اسلوب غزل اور کلاسیکیت کو مقدم رکھا۔

جناب سلطان سکون اعلیٰ انسانی اقدار کے پرستار ہیں اور ان کی شاعری ان ہی اقدار کی چاہت اور خلوص سے مزین ہے اور اپنے عہد کی طرح ہر عہد میں زندہ رہنے والی شاعری ہے۔

شاہنواز سواتی:

یہ خوبصورت لب و لہجے کا شاعر اور درویش صفت انسان اپنے بارے میں ہمیشہ کسر نفسی سے کام لیتا ہے اور خود کو پروجیکٹ کرنے میں از حد شرمیلا واقع ہوا ہے۔ تعلقات عامہ کے اس دور میں عین ممکن تھا کہ سکون جیسا شاعر اس خوبصورت ہیرے کی طرح کسی کو دکھائی نہیں دیتا جو کسی بے رحم چٹان کے اندر رہ جائے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اپنی بے مثال شاعری اور اعلیٰ کردار کی بدولت اس نے چٹان کو توڑ ڈالا اور اپنی منزل کی طرف مکمل کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہے۔ سلطان سکون بہت ہی حقیقت پسند شاعر ہیں۔ معاشرے سے شاکی ہونے کے باوجود سکون مایوس نہیں ہے اور ان راہوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ جن پر چل کر ہم محبت کی معراج تک پہنچ سکتے ہیں سرور زندگی کا رس نچوڑ سکتے ہیں۔

احمد حسین مجاہد:

سلطان سکون صاحب جس طرح زندگی میں قدروں کو پسند کرتے ہیں بالکل اسی طرح شاعری میں بھی روایت پسند ہیں وہ ہر بات ایک قرینے سے کرتے ہیں۔ ان کا اسلوب شعر سادہ مگر دل میں گھر کر لینے والا ہے۔ ان کے کئی اشعار بقول میر لوگ گلیوں میں پڑھتے پھرتے ہیں۔

تنویر حسین شاہ:

سلطان سکون شفاف دھند میں لپٹے ہوئے ایک انسان ہیں جو اس قدر شفاف ہیں کہ گرفت نگاہ سے باہر ہیں سچے اور کھرے انسان، ان کی حساس طبیعت میں دردمندی، محبت اور خلوص کا آمیزہ عاجزی کی چاندنی میں گندھا ہوا ہے۔

خورشید ربانی:

سلطان سکون کا کلام اچھی غزل کہنے والوں میں ہوتا ہے۔ان کا کلام کلاسیکل شاعری کی روایات کی پاسداری کے علاوہ جدید فکر اور عصرِ موجود کے رویوں سے ہم آہنگ ہے۔ان کی شاعری میں محبت، آرزو، فکر اور معاشرتی دکھوں کا اظہار واضح طور پر ملتا ہے۔انھوں نے ایک اچھے اور زندہ شاعر کی طرح اپنے تجربات اور احساسات کو فنِ شعر میں سمویا ہے ان کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے اور رومانیت کا ایک خاص رنگ بھی۔

ان کا غم غزل کے مزاج سے آشنا بھی اور عصری شعری ضروریات سے واقف بھی۔

طارق نعیم:

بلاشبہ سلطان سکون کی شاعری دھیرے دھیرے بہتی ندی کی طرح ہے۔جس کے کناروں پر جذبوں، محبتوں اور جدائیوں کے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے ہیں۔ بیان کی سادگی پڑھنے والے کو اپنے سحر میں لے لیتی ہے۔ لہجے کی بے ساختگی اور لفظوں کے دروبست میں ایک الگ باغ سجا رکھا ہے۔

☆☆☆

منظوم خراجِ تحسین

سلطان سکون کی نذر

(اجمل نذیر)

میرے دل کی زباں
میرے سلطاں سکوں
تو ہی ارضِ سخن کا ہے ماہتاب بھی
تو ہی ارضِ سخن کا ہے اِک سائباں
میری مٹی میں کھلتے ہوئے پھول جتنے رہے تر بہ تر
اُن کے رنگ اور خوشبو میں تیری جھلک ہی نمایاں رہی
میری مٹی میں طرزِ سخن کے دیے، جس قدر بھی جلے
اور بنے روشنی کے جہاں تک امیں
ان کا روغن فقط اِک تری ذات تھی
تو وہ کوہسار ہے، جس کی سنگت پہ نازاں رہے ہم سفر
اور تری رہگزر پر قدم بہ قدم
اُن کو رفعت ملی
اپنی خوش قسمتی پر جہاں تک کریں ناز کم ہے
کہ ہم کو جو حاصل رہی ہے رفاقت تری
اِک یہی ہے سبب آج جتنا لکھوں
اور میرا قلم
جو بنے ترجماں میرے احساس کا
میرے جذبات کا
میرے دل کی زباں
میرے سلطاں سکوں
تو ہی ارضِ سخن کا ہے ماہتاب بھی
تو ہی ارضِ سخن کا ہے اِک سائباں

☆☆☆

سکوؔن کے نام

(تاج الاسلام عاجزؔ بشنکیاری)

ہم نے کیے ہیں اپنے دل و جاں سکوں کے نام
لائے قصیدے لکھ کے غزل خواں سکوں کے نام

پایا نہ چین عالمِ نا پائیدار میں
لیکن ملا ہے درد کا درماں سکوں کے نام

کس کو طلب نہیں ہے کہ اس کو ملے سکوں
ہیں آج سب کے حسرت و ارماں سکوں کے نام

اہلِ سخن نے پیار کے اظہار کے لیے
بزمِ سخن کا لکھا ہے عنواں سکوں کے نام

ہے مطلعِ غزل سے نمایاں سکوں کی شام
عاجزؔ ہے میرا مقطع بھی سلطاں سکوں کے نام

☆☆☆

محترم سلطان سکون کی نذر

(پروفیسر بشیر احمد سوز)

وہ ایک شخص جسے ہم سکون کہتے ہیں
ردائے فقر میں لپٹا ہوا قلندر ہے
جو ایک سادہ سا شاعر، ادیب ہے لیکن
سخن وروں میں وہی بخت کا سکندر ہے

وہ میرے شہر کے قد آوروں میں شامل ہے
جو اپنی ذات کی کٹیا میں قید رہتا ہے
اسی لیے تو بڑا معتبر ہے نام اس کا
وہ شعر کہتا ہے جب دل سے شعر کہتا ہے

وہ حرف سادہ سے موتی تراشنے والا
کمال دست ہنر کو اُٹھا کے لایا ہے
"وہ کوئی خواب نہ کوئی خیال ہے" لیکن
قلم کی نوک پہ موتی سجا کے لایا ہے

....

چلو کہ اس کے تخیل کا بانکپن دیکھیں
سنا ہے برگِ معانی سے رَس اُترتا ہے

عجیب بات ہے اس کے خیال کا گوہر
قبائے شعر میں جڑ کر بہت سنورتا ہے

ہر ایک صبح نئے کاسۂ تخیل میں
صبا کے ہاتھ سے موتی اٹھا کے بھرتا ہے
کمال فن سے جو رشتہ تلاش لیتا ہے
حریم قلب و نظر سے وہ جا گزرتا ہے

وہی سکون جو سنگِ گراں اُٹھاتا ہے
وہی سکون چلن جس کا سخت کوشی ہے
دیارِ شعر و سخن میں ہیں رونقیں کیا کیا
مرا خیال ہے آج اس کی تاج پوشی ہے

چلو کے مل کے اُسے باوقار کرتے ہیں
سلام جس کو یہ سرو و چنار کرتے ہیں
☆☆☆

نذرِ سلطان سکون

(پروفیسر محمد زمان مضطر)

یوں تو ہر ایک دل میں ہے چاہت سکون کی
دل میں مرے مگر ہے عقیدت سکون کی

مرشد ہیں وہ طریقِ سخن میں مرے لیے
کیوں ہو نہ میرے دل میں ارادت سکون کی

بے جا نہیں جو ان کو امیرِ سخن کہوں
ہم سب کو ہے قبول قیادت سکون کی

مضطر ملے نہ کیوں انھیں ایوارڈ صدر کا
ہے کشورِ ادب پہ صدارت سکون کی

لایا نہیں ہمیں یہاں کام و دہن کا شوق
لائی ہمیں تو صرف محبت سکون کی

مضطر سکوں رہے نہ رہے تا ابد مگر
دائم رہے گی شعر کی شوکت سکون کی

مضطر خدا کرے سرِ آفاقِ شاعری
دائم ہو آب و تاب سلامت سکون کی

☆☆☆

اے سلطان سکون

(احمد حسین مجاہد)

اے سلطان سکون ہمارے
اے سلطان سکون

تپتا ہاڑ سلگتا ساون
پت جھڑ اور پھل کھیلی
سارے سنگی بیلی
سارے نیک شگون
اے سلطان سکون

دیپک راگ خموشی تیری
تیرے سانس ملہار
تو سچا فنکار
شاعری تیرا جنون
اے سلطان سکون

تو جنگل کی ٹھنڈی ہوا ہے
سانت سے کی چھاؤں
اونچا تیرا ناؤں
شبد ترے افسون
اے سلطان سکون

منتخب غزلیات

کوئی خواب ہے نہ خیال ہے یہ ملال ہے
کوئی ہجر ہے نہ وصال ہے یہ ملال ہے

کوئی چاؤ ہے نہ لگاؤ ہے نہ بناؤ ہے
نہ جواب ہے نہ سوال ہے یہ ملال ہے

کوئی رنگ ہے نہ ترنگ ہے نہ امنگ ہے
نہ وہ ذوق و شوق بحال ہے یہ ملال ہے

نہ کوئی لگن نہ کوئی چبھن نہ کوئی سخن
نہ غزل نہ کوئی غزال ہے یہ ملال ہے

نہ وہ خال و خد نہ کسی میں تم سی ادا کوئی
نہ تمھاری کوئی مثال ہے یہ ملال ہے

نہ وہ چلمنیں ہیں نہ اب وہ نیم نگاہیاں
نہ وہ جذبِ حسن و جمال ہے یہ ملال ہے

وہی روز و شب وہی صبح و شام بجھے بجھے
وہی گردشِ مہ و سال ہے یہ ملال ہے

اسی ایک لمحے پہ وقت آ کے ٹھہر گیا
نہ عروج ہے نہ زوال ہے یہ ملال ہے

یہاں حسن اب لب بام ہے سرِ عام ہے
سرِ راہ رقصِ جمال ہے یہ ملال ہے

یہاں دشمنی یہاں نفرتیں ہیں عروج پر
یہاں چاہتوں پہ زوال ہے یہ ملال ہے

یہاں دل میں اور ہے کچھ زباں پہ ہے اور کچھ
یہاں خندہ روئی بھی چال ہے یہ ملال ہے

یہاں قدر داں نہیں کوئی خلق و خلوص کا
یہاں حرمتِ زر و مال ہے یہ ملال ہے

یہاں مست ہیں سبھی اپنے عیش و نشاط میں
کسے غم زدوں کا خیال ہے یہ ملال ہے

یہاں جس کا حال بھی پوچھیے وہ یہی کہے
یہ ملال ہے وہ ملال ہے یہ ملال ہے

فقط اپنے حال پہ دل گرفتہ تو ہم نہیں
یہ جو خلق شہر نڈھال ہے یہ ملال ہے

یہ جو چشم تر لیے پھر رہا ہوں میں در بدر
یہ مری وفا کا مآل ہے یہ ملال ہے

نہ وہ آ سکیں نہ سکوں ہم وہاں جا سکیں
وہی حسرتِ پر و بال ہے یہ ملال ہے

کعبہ بنایئے کہ کلیسا بنایئے
لیکن دل و نظر کو کشادہ بنایئے

کن مشکلوں سے ہم نے بنایا ہے یہ چمن
اب آپ اس چمن کو نہ صحرا بنایئے

اب پھر سے اس جہاں کو بنانے سے تو رہے
جو ہے بنا ہوا اسے اچھا بنایئے

ممکن نہیں بنانا زمانے کو حسبِ حال
بہتر ہے خود کو حسبِ زمانہ بنایئے

حد سے نہ بڑھ کی گزر جایئے کبھی
کوئی مصالحت کا بھی رستہ بنایئے

اشعار حسبِ ذوق ہی بے شک تراشیے
مفہومِ شعر کو نہ معمّا بنایئے

سارے نقوش بن گئے آنکھیں نہ بن سکیں
اب اُس کا کیا ادھورا سراپا بنایئے

ہیرا سا دل یہ آپ کے مصرف میں دے دیا
چاہے اب آپ اس کا کھلونا بنایئے

اس دور کا عمومی وتیرہ ہے یہ سکونؔ
ایمان بک بھی جائے تو پیسہ بنایئے

بکھرا کے بال چاک لبادہ نہیں کیا
ہم نے کیا ہے عشق تماشا نہیں کیا

اُس کی جفاؤں کا کبھی چرچا نہیں کیا
چپ چاپ سہہ گئے اُسے رُسوا نہیں کیا

جس سے کیا ہے پیار نبھایا خلوص سے
ہم نے کبھی کسی سے بھی دھوکا نہیں کیا

وعدہ کیا کسی سے تو پورا کیا ضرور
ورنہ کسی سے کوئی بھی وعدہ نہیں کیا

گو ہم کسی کو کوئی خوشی تو نہ دے سکے
لیکن کسی کے دُکھ میں اضافہ نہیں کیا

یوں تو کئی خطاؤں کے ہم مرتکب ہوئے
لیکن کبھی ضمیر کا سودا نہیں کیا

رنجیں یہ رنجشیں نہ کبھی اپنے درمیاں
افسوس ہے دلوں کو کشادہ نہیں کیا

پھر یاد آ گئے تو کرو گے کہاں تلاش
ہم کو بھلا کے خود سے بھی اچھا نہیں کیا

صورت ہمارے دل میں وہ اُتری نہیں سکونؔ
سیرت نے جس کے دل میں اُجالا نہیں کیا

❁

بچھڑ کے تجھ سے کہاں مطمئن رہے ہیں ہم
سلگتے بجھتے ہوئے رات دن رہے ہیں ہم

کسی بھی طور سہی زندگی بسر کر لی
گرفتہ دل ہی مگر تیرے بن رہے ہیں ہم

تھی زندگی تو وہی جو کٹی محبت میں
کہ اب تو عمر کے دن رات گن رہے ہیں ہم

نہیں ہیں ملنے کے درویش طبع لوگ ایسے
زمانے دیکھ! کہ اب تجھ سے مجتن رہے ہیں ہم

لیا ہے اپنی وفا کا بھی امتحان سکونؔ
اور اپنے آپ پہ خود ممتحن رہے ہیں ہم

❁

تیری خوشی کے لیے کیا نہیں کیا مرے دل
کسی بھی طور مگر تُو نہ خوش ہوا مرے دل

کہاں کہاں نہ تجھے میں لیے پھرا مرے دل
کہیں ملی نہ ترے درد کی دوا مرے دل

میں اور کیا کروں تُو ہی مجھے بتا مرے دل
بس اور بس میں مرے کچھ نہیں رہا مرے دل

یہ تیرے شکوہ شکایت نہیں بجا مرے دل
کہ یہ تو ہے ترا اپنا کیا دھرا مرے دل

کہا نہیں تھا تجھے میں نے بارہا مرے دل
نہ ہو کسی کی محبت میں مبتلا مرے دل

بتا تو نام کسی ایسے شخص کا مرے دل
کہ جس سے کی ہو کسی نے سدا وفا مرے دل

خدا نہ کس سے ہوا اُس کا واژ با مرے دل
تری طرح کوئی مر تو نہیں گیا مرے دل

یہ اب کے ایسے کڑے دن نہ دیکھتا مرے دل
اگر تُو مان کے دیتا مرا کہا مرے دل

ہر اہلِ دل ترے دُکھ پر دُکھی ہوا مرے دل
نہ دل دُکھا تو اِک اُس کا نہ دل دُکھا مرے دل

کسے سناؤں ترے دُکھ کا ماجرا مرے دل
کہ تیرے دُکھ کی کسی کو پڑی ہے کیا مرے دل

کوئی نہیں ہے ترا درد آشنا مرے دل
گلے لگاؤں تجھے میرے پاس آ مرے دل

انا تو پیار میں ہرگز نہیں روا مرے دل
خفا ہے وہ تو جا اُس کو منا کے لا مرے دل

کہا یہ مان لے اب بھی سکونؔ کا مرے دل
جو تجھ کو بھول گیا اُس کو بھول جا مرے دل

وہ عمر بھر کی رفاقت کا اتنا پھل دے گا
دُکھوں پہ صبر کی تلقین کر کے چل دے گا

کشید کر کے گُلِ جاں کی ساری خوشبوئیں
پھر اس کے بعد زمانہ تجھے مسل دے گا

تجھے ہوا ہے جو شدت سے رنجِ ناکامی
یہ رنج ہی تو تجھے دعوتِ عمل دے گا

خرد کی بات میں کچھ مصلحت بھی ہوتی ہے
جنوں نے جو بھی دیا فیصلہ اٹل دے گا

عدو بُرا کہے جتنا ترے مفاد میں ہے
کہ اس طرح سے وہ کچھ زہر تو اُگل دے گا

میں اُس کو بھول تو جاؤں مگر سوال یہ ہے
زمانہ اُس کا مجھے کون سا بدل دے گا

سکونِ درد کے پودے کو سینچتے رہنا
یہ پیڑ بن کے تجھے کتنے پھول پھل دے گا

❁

کچھ اس ادا سے کچھ ایسے ہنر سے اُترے گا
کہ عمر بھر نہ وہ قلب و نظر سے اُترے گا

عروج پر ہے تمازت دُکھوں کے سورج کی
نجانے کب یہ مرے بام و در سے اُترے گا

نجانے ختم ہو کب بے جہت سفر یارو
نجانے بوجھ یہ کب اپنے سر سے اُترے گا

مرے خیال میں یہ انتہائے گریہ ہے
اب اس کے بعد لہو چشمِ تر سے اُترے گا

ہمارے ضبط کی معیاد ختم کب ہو گی
ہمارے صبر کا پھل کب شجر سے اُترے گا

مرا گھر کسی آسیب کی لپیٹ میں ہے
اب اس کا سایہ کسی دیدہ وَر سے اُترے گا

جو روک رکھا ہے طوفان اپنے دل میں سکونؔ
وہ بوند بوند مری چشمِ تر سے اُترے گا

بہت مٹھاس جو اپنی زباں میں رکھتا ہے
وہ ایک تیر ستم بھی کماں میں رکھتا ہے

یہی تو اُس کا ہنر ہے وہ اپنی باتوں سے
سبھی کو حلقۂ حسن گماں میں رکھتا ہے

ملے بھی وہ تو کبھی ٹوٹ کر نہیں ملتا
خلش ضرور کوئی درمیاں میں رکھتا ہے

ہوائیں اُس کے لیے آندھیاں اُٹھاتی ہیں
جو پیڑ ایک بھی پتا خزاں میں رکھتا ہے

وہ کس پہ وار کرے درگزر کرے کس سے
کئی عدو جو صف دوستاں میں رکھتا ہے

سکونِ صبر کا پھل اور کوئی ہو کہ نہ ہو
دکھوں کی دھوپ میں اک سائباں میں رکھتا ہے

جب طلب ہو تو برستی نہیں اک پل بارش
خود سے برسے تو برستی ہے مسلسل بارش

رات بھر یاد دلاتی رہی اک رات کی بات
رات بھر دل میں مچاتی رہی ہل چل، بارش

نتھیا گلی کے وہ دن رات نہ بھولیں گے کبھی
وہ میں وہ تم وہ گھٹی دُھند وہ جنگل، بارش

ایبٹ آباد کی رونق ہے انھی کے دم سے
سبزہ و گل یہ حسیں لوگ یہ بادل، بارش

بھیگ جاؤ گے ٹھہر جاؤ ابھی جانِ سکون
تھم تو جائے مرے اشکوں کی یہ پاگل بارش

جب بھی کوئی دیرینہ شناسا نظر آیا
صحرا میں گھنے پیڑ کا سایہ نظر آیا

جب آ کے ہوا دست و گریباں غمِ دوراں
پھر کوئی بھی اپنا نہ پرایا نظر آیا

کھاتی رہی دھوکے یہ مری سادہ نگاہی
ایسا نہیں نکلا کوئی جیسا نظر آیا

ہم دل زدگاں کا تو یہی طور رہا ہے
جا بیٹھے جہاں پیار کا سایہ نظر آیا

تفصیل سے جب پرسشِ حالات ہوئی تو
ہر آدمی اندر سے شکستہ نظر آیا

ہے میرے نگر پر کسی آسیب کا سایہ
کچھ روز بھی ڈھب سے نہیں بستا نظر آیا

جا لپٹا ہوں مجذوب سرِ راہ گزر سے
کچھ اُس میں مجھے اپنا حوالہ نظر آیا

چاہا تو بہت ہم نے سکونؔ اُس کو بھلا دیں
ایسا نہ مگر کوئی طریقہ نظر آیا

❁

وار دنیا کا چل نہ جائے کہیں
تو بھی ہم سے بدل نہ جائے کہیں

وہ پشیماں تو لازماً ہو گا
شوق کی عمر ڈھل نہ جائے کہیں

اے غمِ یار تیری عمر دراز
میری آہوں سے جل نہ جائے کہیں

چپ تو بیٹھے ہیں سامنے اُس کے
کوئی آنسو نکل نہ جائے کہیں

اُس نے وعدہ کیا کل آنے کا
کل کا سورج بھی ڈھل نہ جائے کہیں

بھول بیٹھے تو ہیں سکوؔن اُسے
دل اچانک مچل نہ جائے کہیں

❁

درخت کٹتے گئے اور مکان بنتے گئے
ہمارے سر پہ کئی آسمان بنتے گئے

وفائیں گھٹتی گئیں چاہتیں سمٹتی گئیں
نگاہیں برف ہوئیں دل چٹان بنتے گئے

وہ لوگ خواب ہوئے وہ سخن سراب ہوئے
یقین مٹتے گئے اور گمان بنتے گئے

جو خوش خصال تھے ہوتے گئے نظر انداز
جو کج شعار تھے محفل کی جان بنتے گئے

وہ حرف حرف جنہیں بولنا سکھایا تھا
ہمی پہ چلنے کو تیر و کمان بنتے گئے

اسی حساب سے بڑھتی گئی ہے سنگ دلی
جس اہتمام سے پختہ مکان بنتے گئے

سکوںؔ یہ بھی تو اپنوں کا ہے کرم مجھ پر
کہ غیر لوگ مرے مہربان بنتے گئے

❁

روگ جو اب کے لگا ہے کبھی جانے کا نہیں
اب جو دہکا ہے الاؤ وہ بجھانے کا نہیں

ایسا اک شخص مجھے جان سے پیارا ہوا ہے
وہ جو پانے کا نہیں وہ جو بھلانے کا نہیں

اُس نے یوں میرے دل و جاں میں سرایت کی ہے
اب کسی طور بھی میں اُس کو بھلانے کا نہیں

آخری عمر کا ہے عشق خدا خیر کرے
جان لے جائے گا ورنہ تو یہ جانے کا نہیں

نہیں آتا تو نہ آئے مری چاہت کا یقیں
چیر کر دل بھی تو میں اس کو دکھانے کا نہیں

اُس نے کچھ ایسے اُجاڑا مرے دل کا مکاں
جو کسی اور کے بھی بسنے بسانے کا نہیں

مجھ کو اپنے دلِ خوش فہم نے برباد کیا
میں کسی اور پہ الزام لگانے کا نہیں

عزتِ نفس بھی اپنی مجھے پیاری ہے بہت
تیرے کوچے کی تو میں خاک اُڑانے کا نہیں

دُکھ سنا دینے سے ہو جاتا ہے کچھ دُکھ ہلکا
دُکھ مگر یہ ہے کہ دُکھ اپنا سنانے کا نہیں

میرا دُکھ جاننے کو کیا مری آنکھیں کم ہیں
میں ترے سامنے آنسو تو بہانے کا نہیں

خلق و اخلاص و وفا مہر و مروّت کا چلن
نہیں جس شخص میں وہ میرے گھرانے کا نہیں

کٹ کے رہ جائے نہ دنیا سے کہیں یار سکوتؔ
اک چلن بھی ترا موجودہ زمانے کا نہیں

❁

ہمیں کچھ ایسے محبت نے دربدر کیا ہے
کہیں پہ کوئی ٹھکانہ کیا نہ گھر کیا ہے

جگر کے خون سے ہر شعر تر بتر کیا ہے
تو پھر دلوں پہ کسی شعر نے اثر کیا ہے

بڑی ریاضتیں کرنی پڑی ہیں اس کے لیے
دلوں میں یوں ہی نہیں ہم نے اپنا گھر کیا ہے

ہمارے چہرے پہ آثار جو تھکن کے ہیں
یہ ہم نے سوچ کے صحرا کا بھی سفر کیا ہے

کوئی دکھائے تو دو چار دن گزار کے یوں
کہ ہم نے عمر کو جس طور سے بسر کیا ہے

ہر ایک گام پہ دل بیٹھ بیٹھ جاتا رہا
کہ ہم نے جب بھی ترے شہر سے گزر کیا ہے

کہاں کی شاعری یہ شاعری نہیں ہے سکونؔ
دکھوں کو اپنے ہنر سے اِدھر اُدھر کیا ہے

جب تک حصارِ ذات سے باہر نہ آئے تھے
منظر کئی نظر، بہ منظر نہ آئے تھے

اپنی بھی لغزشوں کا ہمیں اعتراف ہے
تم بھی تو آسماں سے اُتر کر نہ آئے تھے

اکثر خوشی بھی ہم سے رہی ہے گریز پا
اکثر خوشی کو ہم بھی میسر نہ آئے تھے

ہم کو ہجومِ فکر و غمِ روزگار میں
سچ ہے کہ یاد آپ بھی اکثر نہ آئے تھے

ڈھلتے گئے ہیں وہ مرے شعروں کے رُوپ میں
وہ دُکھ جو یاد آپ کے منہ پر نہ آئے تھے

کچھ تیز تھیں سکونِ دَرِ دل پہ دستکیں
ورنہ ہم اپنے آپ سے باہر نہ آئے تھے

تم نے اچھا ہی کیا کی نہ عیادت میری
ورنہ کچھ اور بگڑ جاتی طبیعت میری

لوگ دو دن کے تعلق کا بھی رکھتے ہیں لحاظ
تم نے برسوں کی بھلا دی ہے رفاقت میری

خیر اب کر تو لیا ترکِ تعلق، پھر بھی
یاد کر لینا جو پڑ جائے ضرورت میری

مجھ میں اچھی کوئی باتیں ہیں تو وہ اس لیے ہیں
اچھے لوگوں ہی سے اکثر رہی صحبت میری

اور کیا اس سے بڑا ہے کوئی اعزاز سکونؔ
لوگ کرتے ہیں تہہِ دل سے جو عزت میری

۞

تجھے یہ حق ہے شجر پر ہو جو ثمر لے جا
مگر نہ اتنا کہ شاخیں بھی توڑ کر لے جا

کوئی نہ کوئی تو تحفہ ضرور گھر لے جا
نہیں کچھ اور تو چہرہ شگفتہ تر لے جا

اگر چلا ہے کہیں حرف حق سنانے کو
تو ایسا کر کہ ہتھیلی پہ رکھ کے سر لے جا

ترے نگر میں کئی غم نصیب لوگ بھی ہیں
خوشی سمیٹ کے ساری نہ اپنے گھر لے جا

نہیں ضرور کہ ہر شخص غم گسار بھی ہو
نہ سب کے سامنے دامانِ چشمِ تر لے جا

نہ ہو ملال بھی تجھ کو اگر نہ بر آئے
کسی پہ کوئی توقع نہ اس قدر لے جا

سکوتؔ اور کسی قدر کا نہیں قائل
فقط خلوص سے سر اُس کا کاٹ کر لے جا

❁

خود کو ہم آپ بھی یہ روگ لگانے لگ جائیں
جو ملے جس کے اُسے دل میں بسانے لگ جائیں

کیا ستمگار ہیں جو مہر و محبت کے چراغ
خود ہی روشن بھی کریں خود ہی بجھانے لگ جائیں

یہ سمجھ لو کہ غمِ ہجر کا موسم ہے قریب
لوگ جب تم سے بہت پیار جتانے لگ جائیں

کوئی دو چار قدم بھی جو چلے ساتھ اپنے
ہم تو اتنا سا تعلق بھی نبھانے لگ جائیں

کوئی رسماً ہی اگر پرسشِ احوال کرے
ہم وہ خوش فہم اُسے تفصیل بتانے لگ جائیں

جس کسی کو بھی زمیں بوس ہو کرنا مطلوب
اُس کو یہ لوگ بلندی پہ اُڑانے لگ جائیں

تم کسی روز اُسے ایک جھلک دکھلا دو
میرے ناصح کے ذرا ہوش ٹھکانے لگ جائیں

ہمیں جب بھی ترے آنے کی خبر ہو جائے
گھر تو گھر ہے ترے رستے بھی سجانے لگ جائیں

ہم سے اب ترکِ تعلق تو کیے جاتے ہو
سوچ لو پھر کہیں ہم یاد نہ آنے لگ جائیں

اُس نے کل آنے کا وعدہ تو کیا ہے اے دل
یہ الگ بات کل آنے میں زمانے لگ جائیں

ہم جنھیں جانتے ہیں جانِ وفا جانِ سکونؔ
جانے کس موڑ پہ دل توڑ کے جانے لگ جائیں

مری مشکل کا حل کوئی نہیں ہے
ترا نعم البدل کوئی نہیں ہے

لہو اُس پیڑ پر چھڑکا ہے اپنا
کہ جس پر پھول پھل کوئی نہیں ہے

دلوں میں تو کئی گرہیں پڑی ہیں
مگر ماتھے پہ بل کوئی نہیں ہے

وہاں کیا فائدہ سعی و عمل کا
جہاں ردِ عمل کوئی نہیں ہے

تغزل حُسن ہے صنفِ غزل کا
غزل ورنہ غزل کوئی نہیں ہے

سکونؔ اُس کی وفا کا کیا بھروسا
کہا جس کا اٹل کوئی نہیں ہے

❁

بس اُس کو چھوڑ دیا اُس نے جب وفا نہیں کی
پلٹ کے ہم نے کوئی اُس سے التجا نہیں کی

پھر اس کے بعد کہیں طبع مبتلا نہیں کی
ہمارے دل میں کسی اور نے بھی جا نہیں کی

ہمارا زعمِ سخن رہ گیا دھرے کا دھرا
کہ اُس کے سامنے اِک بات بھی بنا نہیں کی

خدا نے بخشی ہے جو خاص اِک ادا اُس کو
بغیر اُس کے کسی اور کو عطا نہیں کی

خدا کو حاضر و ناظر سمجھ کے یہ کہہ دے
کہ ہم نے تجھ سے محبت میں انتہا نہیں کی

مگر تو پھر بھی گلہ مند ہے تو ہوتا رہے
کہ ہم نے تجھ سے وفا کی نہیں تو جا، نہیں کی

خفا کیا ہے خدا کو تو بارہا لیکن
خدا کا شکر خفا خلقتِ خدا نہیں کی

ضرورتیں تو کئی طرح کی رہیں درپیش
امیرِ شہر کے در پہ کبھی صدا نہیں کی

رہی ہے دل ہی میں رُوداد اپنے دُکھ کی سکونؔ
کہیں کہا نہیں کی اور کہیں سنا نہیں کی

☆☆☆
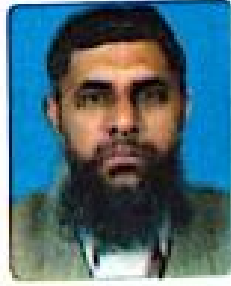
قمر زمان 26 اگست 1974 کو ایبٹ آباد کے گاؤں دو بجتر میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں جب کہ میٹرک تک کی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول (موجودہ سینٹینیل ماڈل سکول) سے حاصل کی، جسے شاعرِ مشرق کی میزبانی کا شرف بھی حاصل ہے۔ میٹرک کے بعد پاکستان ایئر فورس میں شمولیت اختیار کی جہاں سے سنہ 2018 میں سبکدوش ہوئے۔ دورانِ ملازمت حصولِ تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ وفاقی اردو آرٹس کالج سے پہلے بی اے اور پھر ایم اے ایجوکیشن کی سند حاصل کی۔ بعد ازاں پشاور یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ آج کل "ہزارہ میں اردو ادب کے فروغ میں ادبی تنظیموں کا کردار" کے موضوع پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ لکھنے کے ساتھ ساتھ ایبٹ آباد کے ایک نجی کالج میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ آپ کئی قومی و بین الاقوامی کانفرسوں میں شرکت کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں علمی و ادبی و سماجی موضوعات پر آپ کے مضامین مختلف اخبارات و ادبی رسائل کی زینت بنتے رہتے ہیں۔

9 789694 724638